بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ امامیہ کے تبلیغی رسائل کا دوسرا نمبر

اہلبیت اور اسلامی خدمات

مصنفہ

حضرت ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ مدظلہ العالی

(سرپرست رسالہ نور و صدر جامعہ امامیہ کراچی)

انجمن ناشر العلوم مدرستہ الواعظین کراچی ۱۸

قیمت صرف ایک روپیہ

(عہ)

مومنین کرام سے اپیل

بحمد اللہ انجمن ناشر العلوم جامعہ امامیہ کراچی کا یہ دوسرا تبلیغی رسالہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ آپ اس کو پسند فرما کر جامعہ امامیہ کے طلباء اور ارکان انجمن ناشر العلوم کی ہمت افزائی فرمائیں گے

پہلا رسالہ "مولود حرم" قیمت ۵۰ پیسے بحمد اللہ اس قدر مقبول ہوا کہ دو ماہ کے اندر تقریباً ۵۰۰ نسخے فروخت ہوگئے۔

امید ہے کہ آپ ان ہر دو رسائل کو خرید فرما کر ہمیں آئندہ ترقی کرنے اور دیگر مفید کتابیں شائع کرنے کا موقع دیں گے۔

ملنے کا پتہ :-

سردار علی خاں واعظ جنرل سکریٹری انجمن ناشر العلوم مدرستہ الواعظین جامعہ امامیہ ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸

فہرست مضامین

پیش لفظ

خدا کا شکر ہے کہ مدرسۃ الواعظین (جامعہ امامیہ) کراچی کی انجمن "ناشر العلوم" اپنے تبلیغی سلسلہ کا یہ دوسرا نمبر حضرات مومنین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔ اگر مومنین کرام کی طرف سے کارکنان انجمن کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی تو انشاء اللہ بہت جلد ہماری تصنیف و تالیف کا سلسلہ ترقی کر کے اپنے نقطۂ مراد تک پہنچ جائے گا۔ میری دلی دعا ہے کہ جامعہ کا یہ شعبہ میری بقیہ زندگی میں جو اب بظاہر بہت تھوڑی سی رہ گئی ہے جلد از جلد اپنی منازل ترقی کو طے کر جائے۔ مجھ ناچیز سے اس ادارہ کی جو خدمت ممکن تھی میں نے اس میں کوتاہی نہیں کی۔ دامے درمے قدمے سخنے میں اس کی ترقی میں سنہ ۱۹۵۳ء سے متواتر لگا ہوا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کو اس ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ میں خدا کا شکر ادا نہیں کر سکتا کہ میری اور معاونین کی جد و جہد سے چند ہی سال کے اندر یہ ادارہ قابل غبطہ ترقی کر گیا۔ تقریباً ۳ ½ لاکھ روپیہ کی عمارت بن گئی۔ اور اس وقت چھ جماعتیں زیر تعلیم ہیں جن پر تقریباً دو ہزار روپیہ ماہوار خرچ ہو رہا ہے۔ دو واعظ اپنی تعلیم ختم کر کے بحمد اللہ مختلف مقامات پر کار تبلیغ انجام دے رہے ہیں ایک افریقہ میں ہیں دوسرے ضلع گجرات پنجاب میں۔ موجودہ واعظین کلاس کے طلباء جس قابلیت کے ہیں اس کا اندازہ ناشر العلوم کے پہلے تبلیغی رسالہ "مولود حرم" کے مضامین سے آپ کو ہو چکا ہوگا۔

مجھے قوی امید ہے کہ مومنین کرام اپنے توجہ خاص کام کر اس ادارہ کو بنا کر بیش از بیش ترقی کا موقع دیں گے۔

دعاگو

[illegible]

تعارف

از حضرت حجۃ الاسلام مولانا احمد عباس صاحب قبلہ (پرنسپل مدرسۃ الواعظین جامعہ امامیہ) (سرپرست انجمن ناشر العلوم

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔

مجھے یہ اظہار کرتے ہوئے بڑی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ یہاں سے فارغ شدہ واعظین کرام افریقہ اور گجرات کی سرزمینوں پر بحمداللہ نشر علوم آل محمدؐ میں منہمک ہیں۔ جملہ کارکنان انجمن اور بالخصوص خطیب اہلبیت جناب ثقۃ الاسلام علامہ محمد بشیر صاحب قبلہ (فاتح ٹیکسلا)، محقق بے بدل ادیب اعظم جناب مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ مدظلہ صدر جامعہ امامیہ لائق صد تحسین ہیں جن کی مساعی جمیلہ نے اس مرکز علم و تبلیغ کو اس قلیل مدت میں اوج کمال پر پہونچا دیا۔ امسال جناب صدر محترم مدظلہ کی مزید جد و جہد کی بنا پر افاضل طلبہ کی ایک انجمن "ناشر العلوم" وجود میں آئی جس کا پہلا تبلیغی رسالہ شائع ہو کر بحمداللہ خراج تحسین حاصل کر چکا۔ زیر نظر تصنیف "اہل بیت اور اسلامی خدمات" اس انجمن کا دوسرا شاہکار ہے۔ اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی و وافی ہوگا کہ مذہب کے سلسلے میں جدید و قدیم نظریات اور دور حاضر کے پیش کردہ اعتراضات جس نے تعلیمیافتہ نوجوانوں کی متجسس فطرتوں کو منتظر جواب بنا رکھا ہے ان کا واحد حل اس تصنیف میں باختصار سپرد قرطاس کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ شائقین علوم آل محمدؐ اس رسالے کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید فرما کے ہم سے تعاون فرمائیں گے کہ کار تبلیغ آپ کے تعاون کا محتاج ہے۔

والسلام

احمد عباس (سرپرست انجمن ناشر العلوم)

مذہب اور انسان

عشق اور مذہب دو چیزوں سے انسان کو فطری لگاؤ ہے۔ ہمزاد کی طرح یہ دونوں چیزیں اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں اور جب تک نسل انسانی دنیا میں باقی ہے ان دونوں کا سایہ اس پر رہے گا صرف اتنا فرق ہے کہ کہیں یہ نقوش اجاگر ہیں کہیں مدھم۔ جذبات کو ابھارنے میں دونوں برابر کے شریک ہیں جب ان ناپیدا کنار سمندروں میں ہولناک طوفان اٹھتے ہیں تو بسا اوقات عقل و شعور کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتے ہیں۔ اس قسم کی بے اعتدالیاں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ آشفتہ سری کے یہی وہ کارنامے ہیں جنہوں نے عشق و محبت کو بدنام کیا ہے۔

مذہب کیا ہے اور اس کی ضرورت انسان کو ہے یا نہیں۔ ایسے پیچیدہ مسائل ہیں جن پر ہر زمانہ کے ارباب عقل و فہم نے اپنے اپنے نظریات پیش کئے ہیں۔

- مذہب کی خالق انسان کی قوت واہمہ ہے۔ ہکسلے اسی غلط فہمی کا شکار تھا
- مذہب جہالت کا ڈھکوسلا ہے۔ ڈیتھوڈریڈ کا نظریہ
- مذہب دماغی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ جان ڈیوڈ
- مذہب آبائی تقلید کا ایک بھونڈا نمونہ ہے۔ موسیو مارکس

فلاسفہ یورپ کے علاوہ ایشیائی حکما بھی مذہب کو ایک ناقابل توجہ گورکھ دھندا کہہ رہے ہیں۔

- ایک گروہ نے مذہب کو اس لئے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے کہ وہ فتنہ و فساد

اور خونریزی کا سبب قوی ہے۔

• ایک گروہ کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے اصول تجربہ نے بنائے ہیں۔ نہ خدا کی طرف سے نزول ہوا نہ مذہب کے سر ان کے اختراع کا سہرا ہے۔

• نیکی اور بدی کے سرچشمے آسمان سے پھوٹ کر زمین پر نہیں آئے بلکہ ان کا منبع و مجریٰ خود انسان ہی کے دل کے اندر ہے۔ انسان نے نیکی اور بدی کا دروازہ خود اپنے اوپر کھولا ہے۔ میدان حیات میں وہ بار بار ٹھوکریں کھا کر سنبھلا ہے اور حوادث کے نزول سے اس کے تجربہ میں جان آئی ہے۔ یہی تجربے اس کی زندگی کے اصول بناتے چلے گئے ہیں اسی کا نام لوگوں نے مذہب رکھ لیا ہے۔

• جب انسان کا قدم دنیا میں آیا تو اس کو اپنے گردوپیش کائنات کی بے شمار ہولناک قوتیں چہل پہل کرتی نظر آئیں۔ اپنے کو ان کے مقابل انتہائی کمزور پا کر طرح طرح کے خطرے محسوس کئے۔ سورج پھونک نہ دے۔ دریا بہا نہ دیں۔ پہاڑ کچل نہ ڈالیں۔ ہوائیں اڑا نہ دیں۔ درندے پھاڑ نہ کھائیں۔ ان کو رام کرنے کی یہی تدبیر سوجھی کہ سرنیاز خم کر کے ان کی پوجا پاٹ شروع کر دی جائے حقیقت کو سمجھنے کی توانائی عقل میں آئی نہ تھی لہٰذا اس کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا۔

یہیں سے بُت پرستی کی بنیاد پڑی۔ عبادت کے طریقے ایجاد ہوئے۔ ستاروں کے ہیاکل، اگنی کے آتش خانے اور دیوتاؤں کے مندر بن گئے۔ اور اس کا نام مذہب ہو گیا۔

یہ ہیں وہ خوفناک بھول بھلیاں جن میں عقل انسانی محبوس ہو کر اپنا سوچ بچار کھو بیٹھی اور آبائی تقلید نے قیامت تک کے لئے عقائد کی بنیادوں کو استوار کر دیا۔

یہ ہے مذہب کا سرچشمہ جوں جوں انسان کا علم و تجربہ بڑھتا گیا اور مخلوقات عالم کو مسخر کرنے کی قوت پیدا ہوتی گئی وہ ان جاہلانہ عقائد کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوتا چلا گیا اور مذہب کی حقیقت بے نقاب ہو کر اس کے سامنے آگئی۔

• ایک گروہ نے کائنات کا بغور مطالعہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا خالق کوئی اور ہے۔ مخلوقات ارضی و سماوی کے تغیرات یہ بتاتے ہیں کہ کسی قادر مطلق کا دست تصرف ان کے اوپر ہے اور جو ایسا ہے وہی ان کا خالق ہے اور وہی لائق پرستش ہے۔ اس گروہ کا راستہ ملحدوں زندیقوں اور بت پرستوں سے جدا ہو گیا۔ اب مذہبی حلقہ میں دو گروہ داخل ہیں۔

(۱) جس نے ایک غیر مرئی ذات کو معبود سمجھا۔

(۲) جس نے مجسموں کی پوجا کی

لیکن یہ سب فرضی باتیں ہیں جن سے عقل کو لینا دینا ہی تعلق ہے۔

یہ ہیں فلاسفہ اور حکماء کے وہ عقائد جنہوں نے ہزارہا انسانوں کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔

مذہب کب سے ہے ہم پہلے بیان کر چکے کہ مذہب کو فطرت سے ایک مستقل اور دوامی لگاؤ ہے لہٰذا جب سے انسان ہے مذہب بھی ہے۔ تقدم و تاخر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال فلاسفہ ہمارے ہم نوا نہیں۔ ان کی رائے کچھ اور ہے۔

• انسانی تہذیب کے جنم لینے سے پہلے جو دھندلے دھندلے مذہبی نقوش ہمارے

سامنے پیش کیے جاتے ہیں ان کو ہم مذہبی حیثیت نہیں دے سکتے۔ ان کو ایسا ہی سمجھو جیسے کم سن بچے کھلونوں سے دل خوش کر لیتے ہیں۔ ان کے طفلانہ عقائد ارباب ہوش کے لئے قابل توجہ نہیں ہوتے۔ فطرت جب ان بچوں کو عقل و شعور کی منزل پر لے آتی ہے تو یہ اپنے سابقہ افعال و خیالات پر خود ہنستے ہیں۔ (جی۔ ایم مارکس)

• تہذیب انسانی کا آفتاب چمکنے سے پہلے کسی مذہب کے اصول و فروع نہیں بنائے گئے۔ صرف نیازمندی کا اظہار گیتوں یا کہانیوں کے ذریعہ سے ہوتا رہا۔

(مسٹر لینگ)

• تہذیب انسانی نے حضرت مسیح کی پیدائش سے چھ ہزار برس پہلے دنیا میں جنم لیا اسی وقت سے مذہب کی ابتدا ہوئی (میکس مولر)

• تہذیب کے آفتاب نے ولادت مسیح سے سات ہزار سال پہلے حیات انسانی کی سطح پر اپنی روشنی ڈالی اس سے پہلے تہذیب کا پتہ نہیں چلتا اور نہ باقاعدہ مذہب کی کوئی داغ بیل نظر آتی ہے۔ (ہیروڈوٹس)

• ہم کو قدیم تہذیب اور انسانی قدیم مذہب کا پتہ بابل کی قدیم تاریخ سے چلا ہے جس سے ہم یہ یقین کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ بابلی تہذیب تمام تہذیبوں سے مقدم ہے۔ (ہیروڈوٹس)

اس تہذیب کا پہلا نقش علم نجوم و ہیئت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بابلیوں نے سب سے پہلے سیاروں کو مؤثر فی الارض تسلیم کیا۔ ان کی رفتار کے قواعد معلوم کیے گئے۔ مخلوقات ارضی سے ان کے ارتباط کے اصول وضع کیے۔

• اگرچہ اس زمانہ کی ترقی پذیر اسٹرانومی نے ان قیاس آرائیوں اور فرضی

باتوں کو بے اصل ثابت کر دیا ہے تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ اس قدیم تہذیب نے اسرار قدرت کو معلوم کرنے میں بقدر اپنی قوت کے قابل داد حصہ لیا۔

اس معلومات کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاروں کو مؤثر مان کر وہ اس عقیدہ میں راسخ ہو گئے کہ مو الید ثلاثہ کے یہی خالق ہیں۔ اس پر عقلی دلائل بھی قائم ہوئے۔ سیاروں کے ہیاکل بھی بنے۔ ان کی پرستش کے قواعد بھی وضع ہوئے۔ اور مذہب صابیہ یا ستارہ پرستی کی بنیاد قائم ہو گئی۔ (موسیو فیتھ)

• صاحب تاریخ مذاہب لکھتے ہیں کہ محققین فرنگ نے پتہ چلایا ہے کہ بابلی تہذیب کے ساتھ ساتھ یا اس سے کچھ آگے پیچھے مصری تہذیب رونما ہوئی۔ بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ مصری تہذیب بابلی تہذیب سے مقدم ہے۔ اس زمانہ تہذیب میں مذہب کے اصول وضع کئے گئے اور ضبط تحریر میں بھی آئے۔ مصر کے محکمہ آثار قدیمہ نے کھنڈر کھود کر ایک کتاب برآمد کی ہے جو موتیوں کے ہار پر لکھی ہوئی ہے۔ اس میں نماز یعنی عبادت کی ترکیب اور قیامت کا تذکرہ ہے۔ جس سے پتہ چلا کہ مصریوں میں ولادت مسیح سے آٹھ ہزار سال پہلے مذہبی چرچا تھا۔

• یونانی مورخوں نے یہ پتہ چلایا ہے کہ مجوسی مذہب بھی بہت پرانا مذہب ہے ولادت عیسیٰ سے آٹھ ہزار سال پہلے یہ مذہب دنیا میں موجود تھا اور مصری مذہب کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہاں سیاروں میں جلوہ ایزدی دیکھا جا رہا تھا یہاں نور وحدت کی چمک آگ کے شعلوں میں نظر آ رہی تھی۔

• یہودی اور نصرانی خلقت آدم کو ولادت مسیح سے سات یا آٹھ ہزار سال قبل بیان کرتے ہیں اور مذہب کی قدامت کا زمانہ بھی یہی بتایا جاتا ہے لہذا نتیجہ یہ برآمد

ہوا کہ جب سے انسان دنیا میں موجود ہے اسی وقت سے مذہب بھی ہے۔ تہذیب انسانی کے متعلق ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس کا زمانہ چھ ہزار سال قبل مسیح بیان کیا جاتا ہے اور خلقت آدم کا زمانہ سات ہزار قبل اس سے یہ ثابت ہوں کہ آدم سے ایک ہزار سال بعد تک نہ انسانی تہذیب کا وجود تھا اور نہ مذہب کا۔ لیکن اسلامی عقیدہ اس کے خلاف ہے۔ اسلام تو آدم کے زمانہ ہی سے مذہب کا اعلان کر رہا ہے۔

چونکہ اہل یوروپ وغیرہ کے یہ تمام قیاسات تاریخ عالم کے مُدّون ہونے سے پہلے کے ہیں لہذا اس قسم کے تمام نظریات ناقابل توجہ ہیں۔

مذہب کی پہلی تعلیم محققین کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ سب سے پہلے مذہبی تعلیم کا کون سا جزو انسان کے سامنے آیا۔ اکثریت اس طرف ہے کہ اخلاقی تعلیم سے ابتداء ہوئی کیونکہ معاشرتی اور تمدنی فلاح و بہبود کا تعلق بہت زیادہ اسی سے ہی تھا۔

اس تعلیم کی ابتداء کس نے کی؟

فلاسفہ کا جواب یہ ہے کہ اخلاق کا معلم اول انسانی تجربہ ہے۔ معاشرتی اور تمدنی معاملات میں جب انسان کی غلط کاری سے نقصان پہونچا خطرے لاحق ہوئے تو اس کی بند آنکھیں کھلیں اور اپنے سابقہ طریقہ کار کو بدلنے پر تیار ہوا۔ مثلاً

(۱) اپنے ہمسایہ سے بدسلوکی کی اُسے ستایا۔ نتیجہ میں وقت مصیبت وہ ہمسایہ مددگار ثابت نہ ہوا۔ سبق ملا کہ آئندہ ایسا نہیں کرنا ہے۔

(۲) کسی عہدہ پر پہونچ کر غرور و تکبر سے کام لیا۔ زوال منصب پر خاندان و اہل

نے اُسے منہ نہ لگایا۔ اُس کی توہین و تذلیل کی۔ سبق ملا کہ اب ایسا نہ کرنا۔

(۳) جھوٹ بولا تو اس کی سزا بھگتی۔ ندامت نے صداقت کا سبق دیا۔

یوں ہی جس قدر تجربہ آگے بڑھتا گیا اخلاقی حدود معین ہوتے چلے گئے تا اینکہ وقت آنے پر ان کی ایک کتاب بن گئی جس کو فصول و ابواب پر تقسیم کر دیا گیا۔

مذہب کا اس سے کیا تعلق؟

بعض فلاسفہ کی رائے یہ ہے کہ اخلاقی محاسن کا خمیر انسانی طینت میں ازل سے چلا آ رہا ہے۔ وہ بالطبع نیکی کی طرف مائل ہے۔ اغراض و جذبات کے دباؤ میں آ کر بدی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اسلامی نظریہ اس کے خلاف ہے ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اخلاق مذہب کا جزو اعظم ہے اور اس کی تعلیم و تلقین کا سرچشمہ وہی انبیاء و مرسلین ہیں جو احکام الٰہی کی تبلیغ کے لئے اس دنیا میں آئے تھے۔ اسلامی تعلیم چونکہ دین و دنیا کے تمام شعبوں پر حاوی ہے لہذا ہادیان مذہب اسلام کا فریضہ تھا کہ وہ پہلے لوگوں کو اخلاقی درس دے کر معاشرتی اور تمدنی فتنہ و فساد کو دبا تے اور امن و امان کے دروازے ان پر کھولتے۔

تجربہ کو رہنما بنا کر تمام اخلاقی محاسن حاصل کرنا آسان کام نہیں اس کے لئے عمر نوح درکار ہے اور سخت سے سخت مہلکوں میں داخل ہونا ناگزیر۔

اگر کسی چیز کی بھلائی یا برائی اس کے نقصان اور فوائد کوئی پہلے سے ہمیں بتا دے اور اس کے نتائج سمجھا دے تو یہ کام ہمارے لئے کس قدر آسان ہو جاتا ہے اور بے شمار زحمتوں سے ہم بچ جاتے ہیں۔ کسی عمل کا نمونہ انسان کے لئے سبب

سے اچھا معلم ہے۔

فلسفہ یونان کے مصنف نے لکھا ہے کہ ایک بار ارسطو نے اپنے استاد افلاطون سے پوچھا کہ انسان کامل کون ہے اس نے کہا جو تولیدِ مثل کرے پوچھا تولیدِ مثل پیدا کرنے کا طریقہ کار کیا ہے۔ افلاطون نے کہا نمونہ عمل پیش کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تجربہ کو شمع راہ بنانے سے پہلے اگر خدا کا کوئی نیک بندہ اپنے حسن عمل کا نمونہ ہمارے سامنے رکھ دے تو ہم کو اس کی طرف ترغیب بھی ہوگی اور رفت عمل سہولت بھی۔

مذہب کی عالمگیری تمام اقوام عالم میں خواہ وہ کسی طبقہ سے متعلق ہوں۔ کسی نہ کسی صورت میں مذہب کا وجود پایا جائے گا۔ کیونکہ مذہب سے فطرت کو لگاؤ ہے اس کی تین صورتیں ہوں گی۔

(۱) مہذب اقوام میں مذہب کی بنیاد صرف تقلید پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ دلائل عقلی بھی ہوتے ہیں خواہ کمزور ہوں یا قوی۔ یہ نتیجہ ہوتا ہے کسی مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کی روشن دماغی اور اعلیٰ تربیت کا۔ علم کا خاصہ چون وچرا ہے لہذا بے دلیل بات اس کو پسند نہیں آتی۔ اگرچہ آبائی تقلید کے جراثیم ان میں بھی ہوتے ہیں مگر بہت کم۔

(۲) نیم مہذب اقوام میں بھی مذہب کا وجود پایا جاتا ہے مگر ان کے عقائد کا بڑا حصہ رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے کم علمی نظر کو گہرائیوں میں جانے نہیں دیتی۔ یہ رسم و رواج کی پابندی آبائی تقلید کے اثر سے ہوتی ہے تاہم ٹوٹے

بھونڈے کچھ دلائل بھی رکھتے ہیں۔ بہ نسبت پہلے گروہ کے مذہبی جوش ان میں زیادہ ہوتا ہے۔

(۳) وحشی اور غیر مہذب اقوام میں مذہب کا وجود ہے لیکن نہایت بھونڈی صورت سے۔ یہاں عقاید کا بالکلیہ تعلق آبائی تقلید پر ہوتا ہے۔ ان کی عبادت کے طریقے بھی وحشت وجہالت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ افریقہ کے برہنہ وحشی اور اوری نوکو کے غیر مہذب باشندے ناچ کر اور گا کر اپنا عبادتی فریضہ پورا کر دیتے ہیں۔ حمد الٰہی کے جو گیت گائے جاتے ہیں ان سے بھی وحشیانہ پن ٹپکتا ہے۔

میکس مولر اپنی کتاب ریلیجن میں لکھتا ہے پہلے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ مذہب وحشی اقوام میں نہیں ہوتا مگر مشنریوں کی تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ مذہب ان میں بھی ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب انسانیت کا ایک جزو لاینفک ہے مذہب کے مخالفوں نے مذہب کا وجود دنیا سے مٹانے کے لئے بڑی سر توڑ کوششیں کی ہیں مگر کسی زمانہ میں بھی یہ خیال انسان کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوا۔ بلکہ دنیا میں علوم وفنون کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی ہے اور انسانی عقل وشعور میں قوت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر مذہب کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ ہوتی جاتی ہے اور بت پرستی اور الحاد و زندقہ کی جگہ خدا پرستی لیتی جاتی ہے۔

دنیا کے قدیم مذاہب دنیا کا سب سے قدیم بر اعظم ایشیا ہے انسانی تمدن کی داغ بیل یہیں پڑی ہے لہذا مذہبی تعلیم کی اشاعت

بھی یہیں سے ہوئی ایشیائی قومیں اپنا تمدن درست کرنے کے بعد سب سے پہلے افریقہ پہنچیں اور اپنے ساتھ مذہب کا تبرک بھی لیتی گئیں۔ دوسرا گروہ یورپ پہنچا اور تیسرا امریکہ اس طرح رفتہ رفتہ مذہبی خون ہر خطہ زمین کے باشندوں کی رگوں میں دوڑ گیا۔

ایشیا کی یہ خصوصیت بھی یاد رکھنے کی قابل ہے کہ یہاں جتنے مذاہب نے نشو ونما پائی اس نے اپنی اصلیت کو کھویا نہیں۔ کسی نہ کسی حالت میں اس کا وجود پایا ضرور گیا۔ ستارہ پرستی۔ بودھ مت۔ آتش پرستی۔ بُت پرستی اور اسلام آج تک ایشیا کے خاص مذہب بنے ہوئے ہیں۔ باقی براعظموں میں بعض مذاہب یا تو سرے سے نیست ونابود ہو گئے یا رہے تو دھندلے دھندلے نقش بن کر۔

ایشیا کا سب سے قدیم مذہب بودھ مت خیال کیا جاتا ہے اس نے اپنے شباب کے زمانہ میں ایشیا کے نصف حصہ کو اپنے حلقۂ اثر میں لے لیا تھا اس کے رہنما بودھ کہلاتے تھے جس کا آخری گوتم بدھ تھا یہ پچیسواں بودھ تھا۔ اب سے ہزار برس پہلے ہندوؤں کا ایک رہنما شنکر اچارج ہوا ہے اس نے بودھ مذہب کے استیصال پر کمر باندھی اور پوری قوت سے کام لے کر سارا زور خاک میں ملا دیا۔ اس مذہب کے پیرو ہندوستان چھوڑ کر جاپان وچین وغیرہ کی طرف بھاگ گئے جہاں آج بھی یہ مذہب موجود ہے۔

شنکر اچارج نے بت پرستی کو فروغ دینا شروع کیا۔ اور اپنے مذہب کو بودھ مذہب سے بالکل الگ تھلگ ظاہر کیا یہ ایک سیاسی چال تھی جب مقصد

حاصل ہوگیا تو بودھوں کے بہت سے عقائد ہندؤں میں رواج پا گئے وہی تناسخ وہی ترک یا سنیاس وہی حلول وہی مکتی۔

بودھ مذہب نے سب سے زیادہ زور ترک دنیا پر دیا ہے۔ سب بودھ اسی اصول پر اپنی زندگی گزارتے رہے۔ بودھ مذہب میں خالق کا نام نہیں عقل کل کے ہاتھ میں تمام عالم کا نظام ہے۔ جزا و سزا بذریعہ تناسخ ہے۔ ہر بودھ ترقی کر کے عقل کل کے درجہ پر پہونچ جاتا ہے اس آخری درجہ کا نام مکتی ہے۔

غاروں میں، پہاڑوں کے وادیوں میں بیٹھ کر مراقبہ کرنا اس مذہب میں حصول نجات کا بہترین ذریعہ تھا ان کے عقیدہ میں اس قسم کی ریاضت سے عقل کل ان کے اندر حلول کر جاتی تھی۔

انہی کے فلسفہ سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے اپنے تصوف کی بنیاد رکھی اور عزلت گزینی کے لئے خانقاہیں تعمیر کرائیں۔ حلول کے قائل ہوئے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ منصور نے انا الحق کا نعرہ مارا۔ ابن عربی نے سینکڑوں بار خدا سے ملاقات کی اسی کا فیض تھا کہ صوفیائے کرام نے ہمہ اوست کا دم بھرا۔ اسی خوفناک سیلاب کی ایک لہر یہ بھی تھی کہ خدا سے وصل کے قائل ہو گئے۔ گویا یہ اسلامی مکتی تھی۔

یہ تو مختصر حال تھا ایشیا کے مشرقی مذہب کا اب مغربی حصہ کی بھی تھوڑی سی کہانی سن لیجئے حضرت نوح سے لے کر حضرت خاتم الانبیاء تک تقریباً پانچ ہزار سال تک اہل کتاب کا مذہب ایشیائی باشندوں سے اپنا کلمہ پڑھوا تا رہا۔

اسی زمانہ میں ایک اور مذہب بھی ایشیا میں اپنا نور پھیلاتا چلا جا رہا تھا۔

یہ مجوسی مذہب تھا۔ بعض لوگ ان کو بھی اہل کتاب کہتے ہیں۔ اس کے پیرو دو حصوں میں تقسیم ہوئے جو ایران میں جمے رہے وہ مجوسی کہلائے اور جو ہندوستان پہنچے وہ برہمن دیوتا بن گئے۔ ان کے عقائد اور رسم و رواج کی ہم آہنگی پتہ دیتی ہے کہ دونوں ایک ہی بدن کی ہڈی ہیں۔

یہ تفریق مورخین کے بیان کے مطابق طوفان نوح سے قبل ہوئی۔

مصنف نامہ دانشوراں کے بیان کے مطابق مجوسی سلاطین نے چند ہزار سال تک حکومت کی اس کے بعد اسلامی سلطنت کا دور آیا۔ جو وہاں بحمد اللہ آج تک چلی آرہی ہے۔

قدیم ایران مجوسی یا زردشتی یا آتش پرست کہلاتا ہے زردشت نے کوئی نیا مذہب جاری نہیں کیا تھا بلکہ وہ مجوسیت کی ایک اصلاح شدہ صورت تھی۔ زردشت کا زمانہ اب سے تین ہزار سال قبل تھا۔ اس کی آسمانی کتاب ژند ہے اور اس کی شرح پاژند کہلاتی ہے۔ ژند کا یہ فقرہ بتاتا ہے کہ زردشت کا مذہب کوئی نیا مذہب نہ تھا۔

"آئین بزرگ آباد را استوار کن"

یزداں پرستی جس طرح کیومرث کے زمانہ سے چلی آرہی تھی عہد زردشت میں بھی باقی رہی۔ آگ کو انوار الہی کا مظہر یا پرتو سمجھ کر اس کی عبادت کرتے تھے

افریقہ میں جو مذہب تھا وہ بھی دو حصوں میں منقسم ہوگیا محکمہ آثار قدیمہ نے وہاں کے کھنڈروں سے جو الواح برآمد ہوتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بُت پرستی اور خدا پرستی دونوں کا رواج تھا۔ قیامت اور تناسخ کے عقیدے

بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

یوروپ میں بھی مذہب بہت سی شاخوں میں منقسم ہوا کہیں بُت پرستی تھی۔ کہیں بودھ مت کا اثر۔ کہیں فلاسفہ کے اصول پر اعتقاد۔ وہاں کے حکماء نے توحید محض اختیار کی۔ تصوف کی صورتیں بھی پائی گئیں اور الحاد و زندقہ کی بھی۔

مذہب اہل مصر قدیم مصری جانوروں کی پوجا کرتے تھے مقدس کتابوں کا علم صرف پجاریوں سے مخصوص تھا۔ عام لوگوں کو اسی طرح اس تعلیم سے محروم رکھا جاتا تھا جیسے ہندؤں نے ویدوں کی تعلیم کو شودروں سے بچایا تھا اور ان کے کان میں وید کے منتر کی آواز جانا مہاپاپ تھا۔ مصریوں کی قدیم کتابوں سے پتہ چلا ہے کہ وہ خدا پرست تھے اور تمام عالم کا خالق اسی کو جانتے تھے لیکن بعد میں وہ بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ مذہب کے پجاریوں کا تھا۔ جن کی ہر بات پر ایمان لانا واجب تھا۔ گویا وحی ربانی تھی۔ دوسرا گروہ رسم و رواج کا فریفتہ تھا اور پجاریوں کی بات پر زیادہ دھیان نہ دیتا تھا۔

مذہب اہل بابل یہ بھی قدیم مذہبوں میں سمجھا جاتا ہے۔ یہ لوگ ستارہ پرست تھے ان کے مذہب کا نام صائبہ ہے انہوں نے ہر سیارہ کا ایک مندر بنایا تھا جس کو ہیکل کہتے تھے۔ ہر ہیکل کا دیوتا ایک سیارہ کا مجسمہ ہوتا تھا۔ انسانی حاجتوں کو ان سب پر تقسیم کر دیا تھا جو چیز جس سے متعلق ہوتی تھی وہ گویا اس کو پورا کرتا تھا۔ زحل کی عظمت سب سے زیادہ تھی۔ یہی قربانی کا دیوتا تھا اس کے سامنے انسانوں کی قربانی کی جاتی تھی حضرت ابراہیم کے زمانہ میں یہی

مذہب عام طور پر پایا جاتا تھا۔ انسانوں میں وہ حلول باری تعالیٰ کے بھی قایل تھے بالخصوص بادشاہوں کو خدا کا روپ سمجھتے تھے۔

ہندو دھرم ہندو فلسفہ کی ابتدا رگ وید سے ہوتی ہے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے ایک قوم وسط ایشیا اٹھی اور ہندوستان میں آکر آباد ہو گئی جو ایرین کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ لوگ ابتداءً خانہ بدوش تھے پنجاب کی سرسبز وادیوں میں ڈیرے ڈال کر اولاً کاشتکار بنے پھر زمیندار پھر اقبال کی یاوری سے بادشاہت کے درجہ تک پہنچ گئے۔ بُت پرستی ان کا مذہب تھا۔ چاروں ویدوں کو خدا کا کلام سمجھتے تھے انہوں نے سیاسی مصالح کی بنا پر اپنے افراد کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ (۱) برہمن جن کا کام تحصیل علم اور تعلیم دین تھا (۲) چھتری جن کا کام جنگجوئی تھا (۳) ویش جن کا کام تجارتی کاروبار تھا۔ (۴) شودر جن کی سپرد خدمت گزاری تھی۔

ان کا عقیدہ تھا کہ اندر بارش کا دیوتا ہے۔ درونا انصاف کا۔ دشنو سورج کا۔ اگنی آگ کا۔ وا ر یو ہوا کا۔ سرسوتی علم کا۔ اسی طرح تمام قوتوں کا ایک ایک دیوتا مان لیا گیا تھا۔ دیوتا سے مراد ان کی سپرنیچرل قوت تھی یعنی عام طاقتوں سے بالاتر۔

مذہبی کتابیں مذکورہ بالا مذاہب میں ہر ایک آسمانی کتاب اترنے کا مدعی ہے ان میں مشہور کتابیں یہ ہیں۔

زندواستا، مجوس کی۔ توریت، یہودیوں کی۔ انجیل، عیسائیوں کی۔ وید ہندوؤں کی۔ قرآن، مسلمانوں کا۔

ان تمام مذاہب کو اعتقادی لحاظ سے اگر ہم تقسیم کرنا چاہیں تو اس کی تین صورتیں ہوں گی۔

(۱) مذہب وحدانیت

(۲) مذہب تقابل (مذہب مجوس)

(۳) تعدد معبود

مذہب وحدانیت میں تمام اہل کتاب شریک ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے ان رہنماؤں نے جو خدا کی طرف سے ان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اپنی اپنی امت کو وحدانیت باری تعالیٰ کی تعلیم دی۔ لیکن بعد میں یہودی اور عیسائی اس تعلیم پر قائم نہ رہے یہودی حضرت عزیر کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہو گئے اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ عیسائیوں نے روح القدس۔ مسیح اور خدا تین کو قدیم مانا جو اقنوم ثلاثہ کہلائے۔ باوجود اس کھلے ہوئے شرک کے انہوں نے توحید کا دعویٰ نہ چھوڑا اور التوحید فی التثلیث کا ایک عجیب و غریب گورکھ دھندا ایجاد کر لیا۔

مجوسیوں نے اپنے لئے دو خدا تجویز کئے یزداں اور اہرمن۔ یزداں کو خالق خیر مانا اور اہرمن کو خالق شر۔ اس طرح توحید اُن کے ہاتھ سے بھی نکل گئی۔

البتہ اسلام تعلیم محمدیؐ کے صدقہ میں توحید پر قائم رہا اور بحمداللہ اس کی آسمانی کتاب میں آج تک کوئی ایسا تصرف نہ ہو سکا جس سے اس کی توحید پرستی پر ضرب پڑتی۔

رہا مذہب تعدد معبود، اس کا سب سے بڑا مرکز ہندو دھرم۔ بودھ مت۔ جین

مت وغیرہ ہیں۔

خدا پرستی کا وجود کب سے ہے

مذاہب عالم پر مختصر سا تبصرہ کرنے کے بعد اب تھوڑی سی بحث اس پر کرنی ہے کہ خدا پرستی کب سے شروع ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ پہلے یہ بتاؤ کہ خدا پرستی کب نہ تھی۔ یہ تو دنیا میں انسان کے ساتھ ساتھ آئی ہے۔ خدا پرستی کا عقیدہ دو جہت سے پیدا ہوا۔

(۱) ان ہادیان دین کی تعلیم سے جو خدا کی طرف سے ہدایت خلق کے لئے بھیجے گئے تھے جن میں سب سے پہلے حضرت آدم ہیں اور سب سے آخر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ان سب نے جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بیان کی جاتی ہے بنی نوع انسان کو اپنے اپنے زمانہ میں خدا پرستی کا درس دیا۔

(۲) انسان کی عقل نے خدا پرستی کی طرف خود رہنمائی کی جب اس نے اس بات پر غور کیا کہ کائنات کا اتنا بڑا کارخانہ خود بخود تو نہیں بن گیا تو اس کی عقل نے بتایا کہ اس کا بنانے والا کوئی ضرور ہے اور وہ کوئی ایسا ہے جس میں یہ صفات نہیں پائے جاتے جو اس مخلوق میں پائے جاتے ہیں اگر وہ بھی ایسا ہی ہو تو پھر اس کا بھی کوئی خالق ہونا چاہیے۔ یہاں کی مخلوق محتاج الی الغیر ہے اور جو دوسروں کی محتاج ہو وہ خالق نہیں بن سکتی۔ اس طرح اس کو صانع عالم کا پتہ چل گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ وہ صانع عالم صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اگر ایک سے زائد ہوتے تو باہمی اختلاف سے یہ تمام کارخانہ درہم وبرہم ہو جاتا۔ ہر بات میں ان کا متفق رہنا ناممکن تھا۔

یہ عقلی رہنمائی تھی جس نے انسان کو خدا پرست بنایا۔

بُت پرستی کا آغاز ہوا کیسے

ہر قوم میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی قوم میں ہر دل عزیزی حاصل کر لیتے ہیں۔ اور ان کی محبت لوگوں کے قلوب میں جگہ پکڑ لیتی ہے ایسے لوگوں کے مرنے کے بعد اس لئے کہ ان کی کوئی یادگار نظر کے سامنے رہے۔ کبھی یہ شوق تصاویر کے ذریعہ سے پورا کیا جاتا ہے اور کبھی ان کے مجسمے بنا کر۔ اس سے ابتداءً تو یہ غرض ہوتی ہے کہ ان کی صورت سامنے رہے گی تو ان کے نقش قدم پر چلنے کی رغبت باقی رہے گی لیکن رفتہ رفتہ یہ احترام اور تعظیم عبادت میں بدل جاتی ہے۔ اور شیطان ان کے کان میں پھونک دیتا ہے کہ اس محبوب ذات کے اندر چونکہ جلوۂ ایزدی تھا لہٰذا اس کی یادگار میں بھی ہونا لازم ہے۔ اسلامی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جس کا بُت دنیا میں پوجا گیا وہ حضرت شیث علیہ السلام تھے۔

دوسرا سبب بُت پرستی کا یہ ہوا کہ انسانی تخیل نے بعض غیر مرئی چیزوں کو مادی صورت میں دکھانا چاہا۔ مثلاً کسی کے دماغ میں یہ بات آئی کہ علم اور اس کی قوتوں کو محسوسات میں لائے۔ اس نے سوچا کہ علم ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے خدا تک بھی رسائی ہو سکتی ہے اور دنیا کی حاجت براری بھی نیز یہ کہ علم ایک ایسی چیز ہے کہ ہر ذی عقل کو اس سے محبت ہے لہٰذا اس نے اپنے ذہن میں یہ صورت قرار دی کہ علم کی صورت کو ایک خوبصورت عورت کے مجسمہ میں لایا جائے اور اس کے چار ہاتھ ہوں دو اوپر کو اور دو نیچے کو اوپر کے ہاتھ آسمانی برکات حاصل کرنے کو بنائیں اور نیچے کے ہاتھ دنیا پر قبضہ کرنے کو۔ جب یہ مجسمہ تیار ہوا تو اس کا نام سرسوتی رکھا گیا۔

لیکن حقیقت نا آشناؤں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ سرسوتی درحقیقت کوئی دیوی پہلے گزر چکی ہے اس کی پوجا شروع کر دی۔ اسی طرح رفتہ رفتہ تمام قوتوں کے مجسمے بنتے گئے اور ان کی پوجا پاٹ ہوتی گئی۔

اس بُت پرستی کو سب سے زیادہ قوت آبائی تقلید سے ملی۔ لوگوں کا یہ حسن اعتقاد کہ ان کے آباء اجداد بے وقوف نہ تھے انہوں نے ضرور ان بتوں میں کوئی قوت مشاہدہ کی ہوگی جب ہی تو ان تعظیم بجالاتے تھے اس بُت پرستی کا اور زیادہ حامی بن گیا۔

ایک محرک اور بھی تھا۔ لوگ کسی ایسی ذات پر ایمان لانا پسند نہ کرتے تھے جس کا وجود ان کی نظر کے سامنے نہ ہو وہ چاہتے تھے کہ ہم جس کی عبادت کریں وہ ہمارا معبود ہمارے سامنے ہو تاکہ نیاز مندی کی پوری شرطیں بجالائی جاسکیں انبیاء علیہ السلام نے جس معبود برحق کی معرفت کرانی چاہی وہ غیر مرئی تھا۔ لہٰذا عقل کے اندھے اس کو خدا ماننے پر تیار نہ ہوتے۔

اسلام کا تصادم دیگر ادیان سے

جب عقلاً یہ ثابت ہے کہ اس تمام دنیا کا خالق ایک ہی ہے تو دین و دنیا کے متعلق اس کی طرف سے آنے والا قانون بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔

مذاہب عالم کے اصول و فروع میں جو اختلافات رونما ہوئے وہ احکام الٰہی کے لانے والوں کی طرف سے نہ تھے بلکہ لوگوں کی قیاس آرائیوں۔ غلط فہمیوں

اور خود غرضیوں کے نتائج تھے۔ ہر زمانہ میں انبیاء کا مسلسل آتے رہنا اسی غرض سے تھا کہ ابنائے روزگار نے اپنی خود غرضی اور مفاد اندیشی سے جو تبدیلیاں احکام الٰہیہ میں کر دی ہیں ان سے لوگوں کو آگاہ کر دیا جائے اور عمل کی بگڑی ہوئی صورتوں کی اصلاح ہو جائے۔

سب سے پہلے آدم علیہ السلام خدا کے خلیفہ بن کر اس دنیا میں آئے اگرچہ وہ کسی شریعت کے مالک تو نہ تھے لیکن وحی و الہام سے اپنی اولاد کو تمام امور کی حقیقت سمجھاتے رہے ان کی زندگی میں بت پرستی کا آغاز ثابت نہیں ہوتا اور نہ اسلام کے سوا کسی اور دین کے آغاز کا پتہ چلتا ہے۔

حضرت آدم کے بعد جناب شیث علیہ السلام ان کے جانشین ہوئے لوگوں کی نظر میں ان کا بڑا احترام تھا۔ دور دور سے ان کی زیارت کو آتے اور طرح طرح کے تحفے ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی اولاد نے اس خیال سے ان کی موت کو چھپائے رکھا کہ تحفے آنے بند ہو جائیں گے۔ ایک لکڑی کا مجسمہ بنا کر ان کی جگہ پر لٹا دیا۔ اور اس کو کپڑے سے ڈھک دیا جو زیارت کا متمنی آیا اس سے کہہ دیا بیمار ہیں کسی کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دیتے اس طرح عرصہ تک وہ تحفے تحائف لیتے رہے۔ آخر جب قوم کو پتا چل گیا تو انہوں نے جا بجا ان کے بُت بنا کر ایک محفوظ جگہ میں اظہار تعظیم کے لئے رکھ لئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ مدت بعد وہ سب مجسمے پوجے جانے لگے اور بُت پرستی کی بنیاد پڑ گئی۔

حضرت نوح کا دور آنے تک بُت پرستی کا رواج اس قدر عام ہو گیا

کہ خدا پرست خال خال نظر آنے لگے۔ حضرت نوح کو ان کی ہدایت میں سخت سے سخت دشواریاں پیش آئیں کون سی اذیت تھی جو ان کی قوم نے ان کو نہ دی۔ کس حد تک بت پرستی کا رسوخ ان عاقبت بربادوں میں ہو گیا تھا اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ حضرت نوح نے ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کی اور اس گمراہی سے بچانا چاہا مگر ان کے کان پر جوں نہ رینگی۔ بمشکل چند لوگ ایمان لائے۔ کسی قوم کے مفلوج العقل ہونے کی اس سے بدتر مثال دنیا میں مل نہیں سکتی۔ اس قوم کے سامنے دو عذر تھے۔ (۱) آپ ہم جیسے بشر ہیں پھر آپ کو کیا حق ہے کہ ہمیں سمجھائیں۔ آپ پر ایمان لانے والے ہماری قوم کے رذیل لوگ ہیں جو آپ کی پیغمبری کے ثبوت کے لئے کافی نہیں۔

(۲) کیسے ممکن ہے کہ جن بتوں کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے چلے آرہے ہیں آپ کے کہنے سے ہم ان کی پرستش چھوڑ دیں۔ یہ عذر ہر نبی کے زمانہ میں ہوتا رہا انہوں نے طوفان میں ڈوبنا ہلاک ہونا سب کچھ گوارا کر لیا مگر کشتی نوح کو ذریعہ نجات نہ سمجھا اور خدا پر ایمان نہ لائے۔ ابھی دنیا اپنی منازل حیات میں چند ہی قدم آگے بڑھی تھی کہ بت پرستی نے یہ شدت اختیار کر لی۔

تمام دنیا کے غرقاب ہونے کے بعد جب کشتی کوہ جودی پر ٹھہری اور ان کے ساتھی زمین پر اتر آئے تو پھر ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑی۔ اجڑی ہوئی سنسان زمین پھر از سر نو آباد ہوئی۔ اور دنیوی کاروبار جاری ہو گئے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ پہلے بت پرستوں میں سے کوئی باقی رہا ہی نہ تھا۔ لہذا اب جو اس نئی آبادی میں بت پرستی کا دور شروع ہوا وہ ایک نیا دور تھا۔ اب بجائے مٹی یا پتھر یا کاٹھ کے مجسموں کی پوجا کرنے کے جو انسانی شکل کے ہوتے تھے لوگوں نے ستارو‌ں

کی پرستش شروع کر دی۔ اب انسان کی عقلی قوتیں پہلے سے زیادہ ترقی کر گئی تھیں لہذا ان کی نظر زمین سے ہٹ کر آسمان تک پہنچی اور بجائے انسانی مجسموں کے اب ستارہ پرستی کا آغاز ہوا۔

تمام انبیاء کے زمانوں اور ان کی قوموں کی سرکشی اور بغاوت کا اگر ہم تذکرہ کریں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی لہذا چیدہ چیدہ انبیاء کا ذکر کئے دیتے ہیں اسی پر دوسروں کے حالات کا قیاس کر لینا چاہیے۔ قرآن میں تمام قوموں کے کفر و شرک و بغاوت کے حالات مذکور ہیں۔

جب حضرت ابراہیم کا زمانہ آیا تو ستارہ پرستی کا انتہائی زور تھا ہر سیارہ ایک معبود سمجھا جاتا تھا۔ قوم کی بے عقلی سے فائدہ اٹھا کر نمرود نے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا۔ ایسی بے عقل قوم میں رہ کر اور ملک و دولت کا مالک بن کر وہ اپنے کو بشریت کی سطح سے بلند کیوں نہ کرتا۔

ایک طرف تو سیاروں کو موثر فی الموجودات سمجھ کر پرستش کی جا رہی تھی۔ دوسری طرف نمرود کی سطوت سلطنت اور لوگوں کے جان و مال و آبرو سب پر اس کا قبضہ اس کو خدا ماننے پر مجبور کر رہا تھا۔ نجومیوں اور کاہنوں کی غیب دانی نے وحی و الہام کی جگہ لے لی تھی۔ یہ ضلالت کا ایسا تاریک دور تھا کہ کہیں خدا پرست انسان کا وجود ڈھونڈا نہ ملتا تھا۔ اس طلسم شرک و کفر کو تباہ کرنے کے لئے جناب ابراہیم کا ظہور ہوا۔

حضرت کا چچا آذر بت تراشی کے فن میں بڑا ماہر تھا۔ اس کا کاروبار خوب چل رہا تھا حضرت ابراہیم اسی کے زیر تربیت تھے۔ آپ نے اُسے ہر چند سمجھایا مگر

کامیابی نہ ہوئی۔ ایک روز اسی کے گھر میں بتوں کو گھیرے ہوئے کچھ لوگ بیٹھے تھے اور پوجا پاٹ کر رہے تھے حضرت کو دیکھ کر سخت غصہ آیا۔ ان کے پاس جا کر کہنے لگے ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون (یہ کیسی مورتیاں ہیں جن کو تم گھیرے بیٹھے ہو) چچا نے کہا یہ ہمارے معبود ہیں جناب ابراہیم نے فرمایا افسوس تمہاری عقلوں پر تم ایسوں کو اپنا معبود سمجھے بیٹھے ہو جو نہ بولتے ہیں نہ سنتے ہیں۔ نہ دیکھتے ہیں نہ کسی کے نفع پر قادر نہ نقصان پر۔ اوروں کا کیا ذکر یہ تو ضرر کو اپنے سے بھی دفع نہیں کر سکتے۔

حضرت کی زبان سے یہ باتیں سنکر وہ چونکے۔ آزر نے گھبرا کر کہا کیا تم ان معبودوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر تم نے ان کو نہ مانا تو میں سنگسار کر دوں گا مگر یہ دھمکی کارگر نہ ہوئی خاصان خدا ایسی باتوں سے کہاں گھبراتے ہیں۔

جب حضرت ابراہیم نے دیکھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے تو ایک روز موقع پا کر ان کے مندر میں داخل ہو گئے اور ایک کلہاڑے سے دھڑا دھڑ ان کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا۔ جب سب کا صفایا کر چکے تو وہی کلہاڑا اس بڑے بُت کی گردن میں ڈال دیا جس کو مصلحتاً صحیح سالم چھوڑ دیا تھا۔ جب قوم پوجا کے وقت مندر میں آئی اور اپنے بتوں کا یہ تباہ حال دیکھا تو سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ کام ابراہیم کا ہے۔ حضرت کو پکڑ کر لائے اور کہنے لگے کیا یہ نالائق حرکت تم نے کی ہے۔ فرمایا ان کے بڑے نے کی ہے اگر یہ بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لو۔ سبحان اللہ عقل انسانی کو ضرب لگا کر چونکانے کی کیا معقول صورت تھی انہوں نے غصہ میں بھر کر کہا کہیں بُت بھی بولا کرتے ہیں۔ فرمایا پھر تم ایسوں کو خدا کیوں مانتے ہو جو بولنے اور

اُنسے ضرر کے دفع کرنے پر قادر نہیں۔ وہ بت پرست لاجواب ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے بات تو سچی کہہ رہا ہے۔

انتقامی جذبہ بُری طرح طوفان اٹھا رہا تھا۔ حضرت کو پکڑ کر نمرود کے سامنے لے گئے۔ نمرود نے کہا اگر تم نہ مجھ کو خدا مانتے ہو نہ ان بتوں کو تو بتاؤ تمہارا خدا کون ہے۔ فرمایا میرا خدا وہ ہے جو مارتا ہے اور جلاتا ہے نمرود نے کہا واہ یہ کون بڑی بات ہے میں بھی لوگوں کو مارتا اور جلاتا ہوں جسے چاہوں قتل کر دوں جس واجب القتل کو چاہوں چھوڑ دوں۔ بدمغزہ تھا بات کی تہ کو نہ پہونچا اور جہالت کا جواب دیکر اپنے مقام پر خوش ہوا۔

اب حضرت ابراہیم نے ایک اور استدلال کیا فرمایا میرا خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر دکھا دے۔ یہ سنکر وہ کافر مبہوت ہو گیا۔ یہ تھا اسلام کا ٹکراؤ کفر و شرک سے۔

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں ملت ابراہیمی کو بہت کچھ فروغ ہوا مگر بت پرستی کی جڑ نہ کٹنی تھی نہ کٹی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ خدا پرستی کے بازوؤں میں کافی زور آگیا۔ شریعت کا آغاز تو حضرت نوح کے زمانہ ہی سے ہو گیا تھا اب صحیفوں کے ذریعہ سے آسمانی احکام ایک سلسلہ سے آنے لگے اور شریعت کی جڑ مضبوط سے مضبوط تر ہو گئی۔

حضرت ابراہیم کے بعد خدا کی حجتیں برابر آتی رہیں اور بت پرستوں سے مقابلہ ہوتا رہا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کا زمانہ آگیا۔ اس دور میں بھی ایک جھوٹے خدا سے مقابلہ ہو گیا قصہ بہت طولانی ہے۔ ہم تفصیل میں جانا نہیں چاہتے

حضرت موسیٰ نے ہر چند سمجھایا مگر خدائی کا خبط کسی طرح فرعون کے سر سے دور نہ ہوا۔ کج بحثی کرتا رہا۔ آخر خدا نے اس کو اور اس کی قوم کو دریائے نیل میں غرق کر کے بنی نوع انسان کو اس ضلالت کے بھنور سے نکال دیا۔

اسی طرح حضرت ختمی مرتبت کے دور تک جس قدر انبیاء و مرسلین آئے بت پرستی ہر زمانہ میں ان کی ہدایت سے ٹکر لینے کے لئے تیار رہی لیکن خدا پرستی کے مقابل اسے فروغ نہ ہوا۔ بت پرستوں کے تمام استدلالات تار عنکبوت کی طرح برگزیدگان باری تعالیٰ نے توڑ کر رکھ دیئے مگر جن لوگوں پر شقاوت سوار تھی وہ بدستور اپنی ہٹ پر جمے رہے۔

زمانہ اپنی دوڑ میں جب آنحضرت ختمی مرتبت کے عہد نبوت تک پہنچا تو تمام سرزمین عرب پر ضلالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ اب ایک دو نہیں تین سو ساٹھ خداؤں کی پوجا پاٹ ہوتی تھی۔ فترت کا زمانہ چونکہ کئی صدی تک انبیاء و مرسلین سے خالی رہا تھا لہٰذا اس دور کے لوگ خدائی احکام سے قطعاً بے خبر ہو گئے تھے۔

بت پرستوں کے علاوہ جو اہل کتاب کہلاتے تھے وہ بھی صحیح راستہ سے بہت دور جا پڑے تھے۔ احکام الٰہیہ میں انہوں نے من مانے تصرفات کر لئے تھے اور آسمانی کتابوں میں بے شمار تحریفات کے مرتکب ہو چکے تھے توحید کی صورت مسخ کر کے رکھ دی تھی۔ اس بنا پر حضرت ختمی مرتبت کے لئے کام اور زیادہ دشوار ہو گیا۔ آپ کو نہ صرف بت پرستی کی تردید میں دلائل پیش کرنا پڑے بلکہ یہود و نصاریٰ کی غلط کاریوں کا بھی بھانڈا پھوڑنا تھا۔ لامذہبوں سے بھی

مقابلہ تھا مجوسیوں - یونانیوں - رومیوں اور کلدانیوں کے فلسفہ کو بھی غلط ثابت کرنا تھا۔ پھر ان کے علاوہ تمدن اور معاشرہ کی گئی گزری حالت کو بھی سنبھالنا تھا اور یہ سب کام صرف ۲۳ سال کے اندر کرنا تھے۔

اسلام کا آخری دور

یوں تو آدم کے وقت سے خدا کا ایک ہی دین "اسلام" چلا آرہا تھا اس کے اصول کی یکساں تعلیم ہر نبی و رسول نے دی لیکن شریعتیں حسبِ مصلحتِ الٰہی بدلتی رہیں۔ آخری دور حضرت ختم الانبیاءؐ کی نبوت کا تھا۔ آپ کی شریعت تمام شرائعِ سابقہ کی ناسخ قرار پائی۔

چونکہ نبوت نقطہ آخر پر آپہونچی تھی لہذا اس نبوت کے دور میں خلاقِ عالم کو ایک ایسا قانون بھیجنا تھا جو قیامت تک بنی نوع انسان کی رہنمائی کرتا رہے اور اس کے کسی حکم کو بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ یہ اٹل قانون "قرآن" کی صورت میں آنحضرت پر نازل ہوا۔ آپ نے اپنی نبوت کے ۲۳ سالہ مختصر دور میں کیا کیا کام انجام دیئے۔

- خدا کی توحید کا درس دیا۔
- قبائل عرب کو بت پرستی سے باز رکھا
- عرب کی باہمی خونریزی اور لوٹ مار کا بازار بند کیا
- ان کی باہمی عداوت کو محبت و اخوت سے بدلا

- جاہلانہ اور مشرکانہ رسم و رواج کا استیصال کیا۔
- منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔
- وحشیانہ اخلاق و عادات کو اخلاق حسنہ کے سانچوں میں ڈھالا
- حسن عمل کے نمونے دکھا کر بداعمالی کا انسداد کیا۔
- جاہلوں کو تحصیل علم کی طرف توجہ دلائی
- خدا کے فرستادہ قوانین تمدن و معاشرت کو جاری کیا
- کسب معاش کی بند راہیں ان پر کھولیں
- رہبانیت کی لعنت کو ان سے دور کیا
- نجات آخرت کا ذریعہ بتایا
- اسلام کے دشمنوں کی سرکوبی کر کے ان کی قوتوں کو توڑا
- اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی
- راہ خدا میں جان دینے کا ولولہ پیدا کیا
- روحانیت کے درس دئیے
- انسانیت کی حدود کے تحفظ کا طریقہ بتایا۔

تبلیغ کا یہ ایک ناپیدا کنار سمندر تھا جس کو ہم نے چند کوزوں میں بھرا ہے یہ معمولی باتیں نہ تھیں۔ ان دشوار گزار منزلوں کو کامیابی کے ساتھ طے کرنے میں سرکار دو عالمؐ کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ کرنا ہمارے عقل و فہم سے باہر ہے۔ برسوں کے رچے جمے اور گہرے زنگ کو دور کر کے لوہے کو سونا اور خاک کو اکسیر بنانا آسان کام نہیں۔ یہ حضورؐ ہی کی ذات والا صفات تھی کہ ان مرحلوں میں

کامیابی حاصل ہوگئی۔

دینی معاملہ میں تمام مذاہب عالم سے ٹکراؤ تھا۔ سلطنت کے قیام پر ارد گرد کے تمام ممالک سے جنگ مول لینی تھی۔

پھر دین کے ایسے قوانین رائج کرنا جن سے ابنائے روزگار قطعاً ناآشنا تھے اور جس کی ایک ایک تعلیم کو سنکر لوگ وحشی جانوروں کی طرح گھبرائے اور جان لینے اور دینے پر تل بیٹھے۔ جس کی انوکھی سیاست کے قوانین سن سن کر چونکے اور کسی طرح اس کی اطاعت کا قلادہ گردن میں ڈالنے کو تیار نہ ہوئے۔

عیش و نشاط کے سبزہ زاروں میں گلگشت کرنے والوں کو ایک سکڑے ہوئے راستہ سے نکال لے جانا پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانا تھا۔ جذبات کی رَو میں بہ جانے والوں کو صبر و ضبط کی منزلوں سے گزارنا آتش فشاں پہاڑوں کے ابلتے لاوے کو روکنا تھا۔ عبد و معبود کے ٹوٹے ہوئے سر رشتہ کو صدیوں کے بعد از سر نو جوڑنا اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔

رسولؐ کی کوشش اور خدا کی مدد سے وہ سب کچھ ہوگیا۔ جس کے ہونے کی کسی کو اُمید نہ تھی۔ بے دین دیندار بن گئے۔ سفاک و خونریز صلح پسند قرار پائے۔ دشمن دوستوں کی صورت میں نظر آئے۔ دولت مند فقر کے متمنی بنے۔ سرکشوں نے تواضع اختیار کی۔ ظالموں نے ظلم سے ہاتھ اٹھایا۔ لاقانونی کے شیدائی قانون کی گرفت میں آگئے۔ شیطان کے پرستار خدا کے عبادت گزار بندے بن گئے۔ جن کی بد اخلاقی شر پسندی بے دینی و بدکاری شہرہ آفاق تھی اب وہ انسانیت کے بہترین نمونے بن کر دنیا کے سامنے آنے لگے۔

آئین اسلامی کے تحفظ کا دوامی بندوبست

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف ملک عرب ہی کے لئے مبعوث برسالت نہ ہوئے تھے بلکہ تمام کرہ ارض اس وقت سے لے کر قیامت تک آپ کی نبوت کے تحت میں تھا لہذا اسلامی اصول کو برقرار رکھنے اور شریعت محمدی کے قوانین کو اپنی اصلی صورت میں باقی رہنے کے لئے ایک دوامی بندوبست کی ضرورت تھی۔ ورنہ حضورؐ کی یہ محنت چند روز بعد اسی طرح ضائع ہو جاتی جیسے اور انبیائے ماسبق کی محنت خود غرض ایمان فروش اور بد باطن لوگوں کے ہاتھوں برباد ہو کر رہ گئی۔ کوئی قانون چاہے کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو جب تک اس کے نافذ کرنے والے صحیح طریقہ سے اسے نہ چلائیں اور اس کے پابند نہ ہوں اس قانون کے نفاذ سے حسب منشا فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ بعض دفعات پر عمل ہوگا بعض معطل رہیں گی اور جن پر عمل ہوگا وہ غلط طریقہ سے ہوگا۔

پچھلی امتوں کا تجربہ اس کی گواہی دے رہا ہے۔

- توریت خدا کی کتاب تھی جب تک اس کے محافظ انبیاء رہے وہ اپنی حالت پر باقی رہی لیکن جب کاہنوں اور راہبوں کے ہاتھوں میں پہنچی یا احبار کی سپرد ہوئی تو بے شمار تحریفات کی آماجگاہ بن گئی اور ایسے شرمناک واقعات انبیاء علیہم السلام کے متعلق اس میں درج ہو گئے جو عام لوگوں سے بھی منسوب نہیں کیے جا سکتے۔ احکام الٰہی بادشاہوں نے دولت کا لالچ دے دے کر اپنی

منشا کے مطابق یا تو بنوا لئے یا ان کی تفسیر کچھ سے کچھ کرا دی۔ رہبان و احبار چونکہ معصوم نہ تھے لہذا ایسے تصرفات کرنے میں انہیں کچھ باک نہ ہوا۔

• انجیل بھی خدا کی کتاب تھی۔ حضرت عیسیٰ کی بجائے حواریوں کی زبان سے اس کی آیات بیان ہوئیں۔ وہ چونکہ معصوم نہ تھے لہذا ان کے قدم بھی احتیاطی حدود سے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد جب قسیسوں، پوپوں اور پادریوں نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تو پھر وہ بھی پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گئی اور اس میں ایسے لایعنی تصرفات ہوئے کہ اسکو کتاب خدا کہنے میں تامل ہونے لگا اور اس کی اصلیت کا پتہ لگنا ناممکن ہو گیا۔

خدائے کریم نے قرآن کے ذریعہ سے ان تمام تحریفات کی داستان اپنے رسولؐ کو سنا دی تھی اس پر بھی اگر رسولؐ کوئی معقول بندوبست نہ کرتے تو اس کے یہ معنی ہوتے کہ وہ قرآن کا بھی وہی حشر دیکھنا چاہتے تھے جو اس سے پہلے دوسری آسمانی کتابوں کا ہوا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے قرآن مجید ایک صامت قانون ہے

• اگر اس کی آیات کے کوئی غلط معانی سمجھ لے۔
• اگر اس کی شان نزول غلط بیان کر دے
• اگر اس کے الفاظ کے معانی بدل دے
• اگر اس کی تفسیر بالرائے کر دے۔
• اگر عملی صورت غلط پیش کر دے

تو کیا قرآن اس کو ٹوک دے گا؟

قرآن میں بہت سی آیات متشابہات ہیں جن کے کئی کئی معانی ہو سکتے ہیں

اس کے بہت سے احکام تفسیر طلب ہیں۔

کیا قرآن بتادے گا کہ خدا و رسولؐ کی مراد اس آیت سے یہ ہے؟

یہ مشکل تو اسی شخص سے حل ہو سکتی ہے۔

- جس نے براہ راست رسولؐ سے ہر آیت کا مفہوم معلوم کیا ہو۔
- جو معصوم ہو۔ اپنی طرف سے کوئی بات کہنے کا اندیشہ اس کی ذات سے نہ ہو۔
- سہو و نسیان اسے عارض نہ ہو
- بجائے دنیوی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے وہ خدا کے یہاں سے پڑھا پڑھایا آیا ہو۔
- پوری کتاب کا علم اس کے سینہ میں ہو

کیا یہ صحیح ہے کہ صرف کتاب مکمل ہدایت کے لئے کافی ہے۔ اگر کافی ہوتی تو قرآن خود یہ نہ کہتا یضل بہ من یشاء و یہدی بہ من یشاء

اب اسکو ایک اور طریقہ سے سمجھئے اسلام نام ہے علم و عمل کا۔ جس طرح کوئی پرندہ بغیر دونوں بازوؤں کے پرواز نہیں کر سکتا اسی طرح بغیر علم و عمل دونوں کے اسلام ناقص ہے۔ قرآن سے علم تو لیا جا سکتا ہے لیکن عمل حاصل کرنا ممکن نہیں وہ اقیموا الصلوٰۃ سے نماز کا وجوب بتا سکتا ہے لیکن ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد اور نماز ادا کرنے کا طریقہ نہیں بتا سکتا۔

لہٰذا عقلی فیصلہ یہ ہے کہ ہر زمانہ میں عمل کی صحیح صورت پیش کرنے کے لئے ایک ایسا ناطق وجود اس کے ساتھ ہونا چاہئے جس کے عمل کی تصدیق خدا

رسول نے کردی ہو۔ اور ایسا شخص سوائے معصوم کے دوسرا نہیں ہو سکتا۔

آنحضرتؐ کے زمانہ میں مخالفین اسلام نے احکام اسلام پر جو اعتراضات کئے حضرتؐ نے ان کے جوابات دیئے اور معجزات کے ذریعہ سے ان پر یہ ثابت کیا کہ میں خدا کا فرستادہ ہوں۔ لیکن آنحضرت کے بعد بھی اعتراضات کا یہ سلسلہ جاری رہنے والا تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ آنے والے زمانوں میں ادیان عالم کے حکمائے و فلاسفہ اسلام سے روشناس ہونے کے بعد اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگانے والے تھے اور الہیات و اخلاقیات اور تمدنی اور معاشرتی مسائل کے متعلق نئے سے نئے نظریئے پیش کرنے والے اور دقیق سے دقیق بحثیں چھیڑنے والے تھے۔ ان کے دفعیہ کے لئے بھی کوئی دوامی بندوبست ہونا چاہیئے تھا۔

اور اس لئے بھی کہ

دنیا میں قیامت تک سیاسی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ معاشرتی بے شمار قانون بنیں گے اور بگڑیں گے۔ ہر زمانہ والے اپنے رائج الوقت قانون کو دنیا کا بہترین قانون سمجھیں گے۔ ان کے مقابل اسلامی قانون کی ساکھ قائم رکھنے اور خدائی قانون ثابت کرنے کے لئے ایسے لوگوں کی یقیناً ضرورت تھی جو خدا و رسولؐ کیطرف سے اس قانون کے ذمہ دار بنائے گئے ہوں اور ان کے قول و فعل پر عصمت کا پہرہ ہو اور پوری کتاب خدا کا علم ان کے سینہ میں ہو۔ ورنہ دوسروں کے مقابل ان کو کامیابی ناممکن ہوگی۔

یہ ہیں وہ نازک مسائل جن پر غور کرنا ہمارے رسولؐ کا فرض تھا۔ ۲۳

سال تک آنحضرتؐ کو اپنے مشن کی تکمیل و ترویج میں جو مصائب برداشت کرنا پڑے ان کا سامنا نہ کسی نبی کو کرنا پڑا نہ رسول کو۔ خود حضورؐ نے فرمایا ہے۔

ما اُوذِی نبی مثل ما اوذیتُ۔ (کوئی نبی میری طرح نہیں ستایا گیا) پس جو کام اتنی محنت و جانفشانی سے کیا گیا تھا۔ اس کو کس طرح عوام الناس کے رحم و کرم پر چھوڑا جا سکتا تھا بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ حضرت کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہ تھا دین الٰہی کی طرف سے یہ غفلت ورزی۔ دین کی دشمنی سے تعبیر کی جا سکتی تھی۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ حضرت اس اہم کام کو صحابہ کرام کی سپرد کر گئے تھے وہی اس مشن کے محافظ اور کتاب خدا کے مفسر تھے۔

اس کے متعلق صرف اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ اوّل تو صحابہ معصوم نہ تھے لہذا ان سے غلطی کا امکان تھا۔ اپنے معصوم ہونے کا نہ خود انہوں نے دعویٰ کیا نہ ان کے تابعین نے۔ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان سے بیشمار غلطیاں ہوتی رہی ہیں اور آیات قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں ان کے درمیان اختلاف رہا ہے۔ اور اختلاف کی صورت میں ہر ایک کی رائے صحیح نہیں مانی جا سکتی۔

دوسرے صحابہ کا دور پہلی صدی میں ختم ہو گیا لیکن قرآن آج تک باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔

تیسرے صحابہ میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو نزول قرآن کے آغاز میں موجود ہوں اور کل قرآن کا نزول ان کی موجودگی میں ہوا ہو اور رسولؐ نے ہر سورہ اور ہر آیت کی تفسیر اور شان نزول ان سے بیان کر دی ہو۔

صحابہ کے ایمان لانے کی صورت تو یہ رہی ہے کہ بعثت کے پہلے سال سے لے کر حضرتؐ کی وفات تک لوگ ایمان لاتے ہی رہے اس صورت میں کل قرآن کا علم ان کو کیسے ہو سکتا تھا۔ عہد رسالت میں نہ تو قرآن کا باقاعدہ درس ہوتا تھا کہ ہر مسلمان اس کے احکام سے باخبر ہوتا رہتا اور نہ قرآن بصورت کتاب جمع ہوا تھا کہ ایک ایک نسخہ ہر ایک کو دیدیا جاتا۔ بہت سے اصحاب تو ایسے تھے جنہیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ کتنے احکام نازل ہو چکے ہیں اور کون سا حکم کب آیا ہے یا کس آیت سے منسوخ کیا گیا ہے

حضورؐ نے اپنی وفات کے وقت ایک لاکھ بیس ہزار مسلمانوں کا مجمع چھوڑا یہ سب صحابہ ہی تھے۔ کیا یہ سب قرآن کے عالم تھے، کیا ان سب کا عمل احکام الٰہی پر تھا، اگر نہیں تھا تو پھر ان کو معلم و محافظ قرآن کیسے بنایا جا سکتا تھا۔

کیا ایسے لوگوں پر جنہوں نے پورا قرآن سن بھی نہ پایا ہو اس کا بھروسہ ہو سکتا تھا کہ یہ آیات کا صحیح مفہوم بیان کر سکیں گے۔ بہت سے صحابہ تو ایسے بھی تھے کہ صحبت رسولؐ میں بیٹھ کر حضور کی بات کو کان لگا کر سنتے بھی نہ تھے اور جب باہر آتے تھے تو دوسروں سے پوچھتے تھے ماذا قال انفا (آیہ) حضورؐ نے ابھی کیا فرمایا تھا۔

کچھ ایسے بھی تھے کہ جب مسلمانوں میں بیٹھتے تو کہتے ہم ایمان لے آئے اور جب کفار سے ملتے تو کہتے کہ ہم تو تم ہی میں سے ہیں ہم تو ان سے دل لگی کرتے تھے ان کا نام چاہے منافق ہے مگر تھے صحبت رسولؐ میں بیٹھنے والے ہی۔ لفظ صحابہ کا اطلاق تو بہر حال ان پر بھی ہوتا ہی تھا۔

رہے وہ معدودے چند حضرات جو سابق الاسلام کہلاتے ہیں اور نزول

قرآن کا آغاز جن کے ایمان لانے کے بعد یا کچھ ہی قبل ہوا تھا تو یہ کام ان کی سپرد بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ انہوں نے مفہوم آیات کے متعلق اپنی غلط فہمیوں کا خود اقرار کیا ہے اور ان کی معلومات اس قدر محدود تھی کہ وہ قضایا کا فیصلہ قرآن سے کرنے میں قاصر رہتے تھے اور حضرت علیؑ سے فیصلہ کرا کر اپنی پریشانی دور کرتے تھے۔

ایسی صورت میں جبکہ پوری کتاب کا علم ان کے پاس نہ تھا۔ پورا قرآن ان کے سینوں میں محفوظ نہ تھا اس اہم خدمت کا ذمہ دار ان کو کیونکر بنایا جاسکتا تھا۔ صحابہ میں صرف ایک ذات علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ایسی ضرور تھی جو ابتدائے عمر سے حضرت رسولخداؐ کے ساتھ رہے تھے۔ اور جلوت و خلوت میں کسی وقت ان سے جدا نہ ہوتے تھے۔ جب کوئی سورہ یا کوئی آیت نازل ہوتی تھی آنحضرت سب سے پہلے اس کا مفہوم ان ہی سے بیان کرتے تھے۔ لہذا پوری کتاب کا علم رسولؐ کے بعد انہی کو ہوسکتا تھا مسلمان مفسرین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ آیہ من عندہٗ علم الکتاب کا مصداق علی علیہ السلام ہیں۔ اگر علیؑ کے سوا اوروں کو بھی پوری کتاب کا علم ہوتا تو وہ جمع قرآن کا کام موافق نزول خود کرتے ایسے لوگوں پر نہ چھوڑتے جو ان سے بہت بعد میں ایمان لائے تھے اور ان کے سامنے کے بچے تھے

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب تک صحابہ دنیا میں رہے وہ محافظ کتاب خدا اور ہادی امت بنے رہے ان کے بعد یہ کام علماء کی سپرد ہوا جو آج تک چلا آرہا ہے لیکن یہ کہنا بھی زبردستی ہے۔

اگر صحابہ محافظ تھے تو ذرا اسلامی کتابوں سے یہ ثابت کیا جائے کہ کتنے ادیان کے علماء و حکماء سے ان کے مناظرے ہوئے۔ کتنے استدلات ان کے بیان

کئے ہوئے زبان زد خاص و عام ہیں۔ الٰہیات کے کتنے مسائل پر انہوں نے روشنی ڈالی۔ خلقت انسانی کے کتنے پس پردہ راز انہوں نے کھولے۔ اخلاقیات کے متعلق کیا کیا درس دئے۔ مخلوقات عالم کے کیا کیا اسرار انہوں نے بیان کئے۔

اب رہے علمائے کرام انہوں نے جتنا کتاب خدا کو سمجھا اور احکام اسلام پر عمل کیا وہ تو اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دین کے تہتر فرقے ہوگئے۔ اگر اس میں علمائے اسلام کا ہاتھ نہ تھا اگر یہ ان کی خود رائیوں کا نتیجہ نہ تھا تو بتاؤ اس ہولناک تخریب و تفریق کا باعث کون تھا؟

اس عظیم الشان اختلاف کی صورت میں کس فرقہ کے عالموں کی سپرد آپ یہ کام کرنا چاہتے ہیں اور کیوں؟ اگر سب فرقوں کی حفاظت میں یہ کام انجام پا سکتا ہے تو ذرا اسے سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ یہ مانا کہ سب کا ایمان قرآن پر ہے لیکن سمجھنے میں غلطیاں ضرور ہو رہی ہیں ورنہ ایک دین کے تہتر فرقے کیسے ہو جاتے۔

ماشاء اللہ علمائے اسلام کی اسلام نوازی کا تو یہ عالم ہے کہ خیریت سے شریعت محمدی کا کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہ رہا جس میں علمائے کرام نے اختلاف کو راہ نہ دی ہو۔

یہ سب باتیں سرکار دو عالم کی پیش نظر تھیں انہوں نے ہرگز اپنے دین کو بغیر مکمل بندوبست کئے نہیں چھوڑا۔ دنیا اس بندوبست کو ملنے یا نہ مانے مگر وہ تو کام پورا کر کے دنیا سے رخصت ہوئے۔

رسولؐ کا آخری بندوبست

اس بندوبست سے بڑی غرض یہ وابستہ تھی کہ آنحضرتؐ کے بعد آپ کی امت گمراہ نہ ہو اور جو تعلیم حضرتؐ نے دی ہے اس پر کاربند رہے۔ اس کے متعلق ہم یہاں صرف دو حدیثوں کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) حدیث ثقلین۔ ایھا الناس انی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللّٰہ و عترتی اھلبیتی ما اِن تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی و انھما لن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض (لوگو میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک اللہ کی کتاب دوسرے میری عترت میرے اہلبیت اگر تم ان سے تمسک رکھو گے تو ہرگز میرے بعد گمراہ نہ ہو گے اور یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا ہونگی یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آجائیں۔)

اس حدیث میں چند باتوں پر غور کیجئے۔

- یہ حدیث متفق علیہ فریقین ہے۔
- اس حدیث کو تقریباً بیس صحابیوں نے نقل کیا ہے۔
- رسولؐ دو چیزیں چھوڑ رہے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کیلئے ایک چیز کافی نہیں
- دونوں گرانقدر اور عظیم المرتبت ہیں۔
- عترت کے بعد اہلبیت کہہ کر تخصیص کو اور زیادہ مؤکد کر دیا۔ اگر صرف عترت ہوتا تو سارے کنبہ کو داخل کر لیا جاتا۔ اہلبیت میں کوئی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عترت کے بعد اہلبیت کا بیان کرنا ضروری ہوا۔

- ان دونوں سے تمسک ضروری ہے۔
- غرض تمسک گمراہی سے بچاتا ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔
- یہ دونوں جدا نہ ہوں گے۔ لہذا جو صرف قرآن کو لے اور اہلبیت کو چھوڑے وہ گمراہی سے نہیں بچ سکتا۔
- یوم حشر تک یہ جدائی ممکن نہ ہوگی۔ دونوں ساتھ ساتھ حوض کوثر تک پہونچیں گے۔

فرمائیے اس سے زیادہ مکمل بند و بست کیا ہوسکتا ہے۔ گمراہی سے بچنے کی بہترین تدبیر بتادی۔ اگر اصحاب قرآن کے محافظ اور مسلمانوں کے ہادی ہوتے تو بجائے اہلبیت کے اصحابی کہا جاتا۔

بعض کتابوں میں عترتی اہلبیتی کی جگہ سنتی کا لفظ ہے لیکن اس سے اسلام کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ کیونکہ قرآن کی طرح سنت بھی ضامت ہے۔ جس طرح غلطی پر قرآن نہیں ٹوک سکتا سنت یعنی احادیث نبوی بھی نہیں ٹوک سکتیں۔

(۲) حدیث سفینہ ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے مثل اھلبیتی کمثل سفینۃ نوحٍ من رکبھا نجیٰ و من تخلف عنھا غرق وھوی

یعنی میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے کہ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے روگردانی کی وہ ڈوب گیا اور ہلاک ہوگیا۔

اس میں بھی چند باتیں قابل غور ہیں۔

- کشتی نوح کو حضرت نوح نبی نے بنایا تھا اسکی ساخت میں امت کو دخل نہ تھا
- کشتی نوح طوفان سے ٹکرای اور بچ گئی دنیا ڈوب گئی مگر وہ نہ ڈوبی۔
- کشتی نوح پر سوار ہونے والے معدودے چند تھے مگر تھے سب مومن
- اس وقت میں ذریعہ نجات سوائے کشتی نوح کوی دوسری چیز نہ تھی۔

پہلی حدیث میں بتایا کہ ہرگز گمراہ نہ ہوگے دوسری میں یہ بتایا کہ نجات کا ذریعہ صرف میرے اہلبیت ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے زیادہ لوگ اور کیا چاہتے ہیں اور کیوں اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ حضورؐ نے اپنے بعد اپنی جانشینی کا کوی بندوبست نہیں کیا بلکہ امت کی رائے پر چھوڑا اور حکومت کی باگ ڈور بھی ان ہی کے ہاتھ میں دے گئے۔

ایک اعتراض کا جواب ہمارے مذکورہ بالا بیان کو پڑھ کر کوی کہہ سکتا ہے کہ اگر قانون الٰہی کی حفاظت کا بندوبست اور تبلیغ دین کا اہتمام صحابہ اور علمائے اسلام کی سپرد نہیں تھا تو پھر کس کی حفاظت میں رہا۔

اگر آپ یہ کہیں کہ اہلبیت رسولؐ کو اس کا ذمہ دار بنایا گیا تھا تو آپ کے گیارہ اماموں کا زمانہ تو تیسری صدی ہی میں ختم ہوگیا اس دور میں بھی انہوں نے اسلام کی کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دی نہ ان کی ذات سے عام لوگوں کو فائدہ پہونچا۔ ان کی ہدایت و تبلیغ کا محدود دائرہ تھا۔ جس کو تمام مسلمانوں کی ہدایت کا بندوبست نہیں کہا جا سکتا۔ رہے آپ کے بارہویں امام ان سے تو غائب ہونے کی بنا پر کوی فائدہ پہونچا ہی نہیں۔ جو شخص پانچ سال کی عمر میں غائب ہو جائے

اس کے وجود سے تمام اسلامی دنیا کو فائدہ پہونچنا تصور میں بھی نہیں آتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کا کام یہ ہے کہ وہ ہدایت خلق کے لئے اپنی حجت کو ہر زمانہ میں بھیجد ے۔ خلق اللہ کو چاہیئے کہ وہ اس سے ہدایت حاصل کریں۔ لہٰذا خدا نے اپنے رسولؐ کا ایک جانشین جو صفات رسولؐ کا آئینہ تھا اور کتاب خدا کا عالم تھا ہر زمانہ میں اتمام حجت کے لئے موجود رکھا۔ اگر لوگوں نے اس سے فیض حاصل نہ کیا اور اپنے تعصب اور نا عاقبت اندیشی کی بنا پر اس کی ہدایت کو ایک محدود دائرہ تک رکھا آگے بڑھنے کا موقع نہ دیا تو یہ قصور لوگوں کا ہے نہ کہ اس امام برحق کا جو اس فرض کو انجام دینے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

بہت سے انبیاء اس دنیا میں ایسے آئے کہ لوگوں نے ان کی بات کان دھر کر نہ سنی اور ان کو ہدایت کرنے کا موقع نہ دیا تو اس سے انہی کا نقصان ہوا۔ خدا کی حجت ان پر تمام ہو گئی۔ اب وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس چونکہ کوئی ہادی نہ آیا تھا لہٰذا ہم سے باز پرس نہ کی جائے۔ ہم آگے چل کر بیان کریں گے کہ ہمارے ائمہؑ نے اپنے زمانہ میں خلق اللہ کو کیا فائدہ پہونچایا۔

اب رہا بارہویں امام کی غیبت کا معاملہ تو اس کے ذمہ دار بھی ابنائے روزگار ہیں اگر ظلم و ستم پر کمر نہ باندھتے۔ اگر حجت خدا کے وجود کو صفحہ عالم سے مٹا دینا نہ چاہتے تو خدا اپنی اس نعمت سے ان کو محروم نہ کر دیتا۔

آخر کہاں تک ایسا ہوتا رہتا کہ خدا کی طرف سے آنے والے آتے رہتے اور ابنائے روزگار ان کو یا تو قتل کرتے رہتے یا اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بناتے ایک لاکھ چوبیس ہزار سے ساتھ جو کچھ ہوا وہی ان برگزیدگان باری کے ساتھ بھی

ہوتا جو قیامت تک آنے والے ہوتے۔ ایسی صورت میں ایمان بالغیب کا امتحان ہی نہ ہو سکتا۔ اور ایک ہادی کے غائب ہونے سے جو روحانی تکلیف ہوتی ہے لوگ اس کا اندازہ ہی نہ کر سکتے۔

رہا یہ کہ غائب امام کی ذات سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا تو یہ سمجھ کا پھیر ہے امام کا کام صرف یہی نہیں کہ وہ مسجد میں آکر جماعت کی نماز پڑھا یا کوئے یا منبر پر بیٹھ کر مسائل فقہ بیان کر دے۔ تاکہ لوگوں کو اس کے وجود کا فائدہ محسوس ہو امام وقت کی سپرد تو بہت سی چیزوں کی نگہداشت ہے امام کے غائب ہونے پر اعتراض کرنے والے ذرا سوچیں کہ غائب تو خدا بھی ہے۔ ملائکہ بھی ہیں، رسولؐ بھی غائب ہیں تو کیا ان سے ہم کو بحالت غیبت کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ اگر پہونچتا ہے تو کیا وجہ کہ امام سے نہ پہونچے۔ فائدہ پہنچانے کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ وجود سامنے ہی ہو۔ اگر آفتاب پہ ابر آجائے تو کیا دنیا کو اس کے غائب ہونے کی حالت میں کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔

برقی اور مقناطیسی قوت ہماری نظر سے غائب ہے لیکن کیا اس سے فائدہ نہیں پہونچ رہا۔ آپ فائدہ حاصل کرنے کی قابلیت اپنے میں پیدا کیجیے فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔ آپ اپنے بلب کو صحیح رکھئے۔ پاور ہاؤس سے کنکشن درست رکھئے ضرور آپ کے گھر میں روشنی ہوگی ورنہ اندھیرا ہی چھایا رہے گا۔

اگر آپ امام سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہیں تو بذریعہ ایمان و یقین اس سے تعلق پیدا کیجیے سچے مسلمان بنئے اس کا روحانی فیض آپ تک ضرور پہونچے گا آپ شیطان غائب کے بہکانے کے تو معترف ہیں۔ مگر امام برحق کی غائبانہ ہدایت

کے معترف نہیں کیسی عجیب بات ہے۔ امام غائب کتاب خدا کے ساتھ ہے۔ جب بندۂ مومن صراط مستقیم سے ہٹتا نظر آتا ہے وہ کسی ایسے طریقہ سے جو ہمارا جانا ہوا نہیں اس کو بھٹکنے سے بچا لیتے ہیں۔

اگر خدا کی تمام حجتیں ظاہر بظاہر ہی ہدایت کرنے والی ہوتیں تو دنیا والوں کو اس کا پتہ ہی نہ چلتا کہ نظر سے غائب ہو کر بھی ہدایت کی جا سکتی ہے۔ اور جب تک یہ پتہ نہ چلتا۔ خدا کی حاجت براری پر بھی صحیح طور سے ایمان نہ ہوتا اور بکثرت لوگ اسی خیال کے ہو جاتے کہ جب تک حاجت برا نظر کے سامنے نہ ہو اس سے عرض حال کرنا اور حاجت براری کی توقع رکھنا عبث ہے۔ اسی غلط خیال نے تو لوگوں کو بت پرست بنایا۔

اگر ابلیس پوشیدہ رہ کر بہکا رہا ہے تو ایک ہادی بھی خدا کی طرف سے ایسا آنا چاہیئے کہ وہ پوشیدہ رہ کر ہدایت کر سکے ورنہ ابلیس کی قوت ہادی سے زیادہ تسلیم کرنا پڑ جائے گی۔ سوچیے اور سمجھیے۔

اسلام کا نظام حیات

پیغمبر اسلامؐ نے ایک عجیب و غریب نظام حیات دنیا والوں کے سامنے پیش کیا تھا جو ہر حیثیت سے مکمل تھا۔ دنیا و آخرت۔ معاش و معاد کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا شعبہ بھی ایسا نہ رہا جس پر اسلام نے تفصیلی روشنی نہیں ڈالی۔

آنحضرتؐ کے عہد برکت عہد میں دو نظام حیات چل رہے تھے ان کا مقصد اعلیٰ

یا تو اعراض عن الدنیا تھا یا انہماک فی الدنیا۔

پہلے نظام نے لوگوں کو رہبانیت کی طرف رغبت دلائی یعنی اس نظام کی سب سے بہترین تعلیم یہ تھی کہ انسان دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو کر اعتزالی حالت میں اپنی زندگی گزارے نجات آخرت کا انحصار اسی پر ہے۔

دوسرا نظام یہ تھا کہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی کو خوب عیش و آرام سے گزارو کیونکہ اس کے بعد آگے کو کچھ نہیں۔ جو کچھ ہمارے لئے ہے اسی دنیا میں ہے

ظاہر ہے کہ یہ دونوں فلسفے جن کے تحت میں انسانی زندگی کے دور گزر رہے تھے نہایت ہی خطرناک اور خلقت انسانی کی غرض وغایت سے کوسوں دور تھے۔

کیونکہ دونوں نظاموں سے تمدن و معاشرت میں بے انتہا فتنہ وفساد کا پیدا ہوتا یقینی تھا۔ یہ دونوں قانون اگر دنیا کے تمام انسانوں پر لاگو ہو جاتے تو یا تو بستیاں اجڑ جاتیں یا انسانی دنیا حیوانی جذبات کا شکار ہو جاتی۔

آنحضرت نے جو اسلامی نظام حیات ابنائے روزگار کے لئے تیار کیا وہ نہ رہبانیت کا حامی تھا نہ عیش کوشی کا۔ بلکہ ان دونوں کے مابین ایک صحیح راستہ تھا یعنی نہ تو دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہو اور نہ ہمہ تن دنیا کے ہی ہو جاؤ۔

جس کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا کے ضروری کام بھی انجام دو اور آخرت کا سامان بھی فراہم کرتے جاؤ۔ تاکہ نہ دنیا ہاتھ سے جائے نہ دین۔

جسم کے لئے بھی سامان راحت و آرام کی ضرورت ہے اور روح کے لئے کچھ ذخیرہ اندوزی ناگزیر ہے۔ سامان زندگی مہیا کرو مگر اپنی ضرورت کے لحاظ سے۔ لالچ اور خود غرضی کو راہ نہ دو۔ حلال و حرام کی تمیز کرو۔ اپنے حق پر قائم رہو دوسرں

کے حقوق پر ہاتھ نہ ڈالو۔ دنیوی مشاغل میں غرق ہو کر خدا کو مت بھولو۔ اس کی عبادت سے جان نہ چراؤ۔ نفس پرستی کے درپے نہ ہو۔

چونکہ طبیعتیں اس قسم کے نظام حیات کی خوگر نہ تھیں اور زندگی کا مقصد رہبانیت یا عیش کوشی سمجھا جا رہا تھا لہذا اس سکڑے ہوئے راستہ پر چلنے کے لئے کوئی راضی نہ ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی نازک صورت میں آنحضرتؐ کو راہ راست پر لانے میں کس قدر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

جس چیز نے اس مشکل کو حل کیا وہ حضور کا حسن اخلاق یا حسن عمل تھا۔

جب آنحضرتؐ کے حسن خلق اور حسن عمل نے معجزانہ تاثیر دکھائی اور سنگدلوں کے دلوں میں گھر کر کے ہدایت و رشاد کے دروازے ان پر کھولے تو آنحضرت کے بعد بھی اس خلق اور اس عمل کا نمونہ باقی رہنا چاہیئے۔ ورنہ یہ محنت آگے چل کر رائیگاں جاتی آنحضرتؐ کی نبوت تو قیامت تک چلنے والی تھی پس اگر صرف عہد رسالت ہی کے لوگ ایسے خوش نصیب ہوں کہ انسانیت کے کردار کا بہترین نمونہ ان ہی کے سامنے رہے تو بعد والے لوگوں کو یہ شکایت کرنے کا حق ہونا چاہیئے کہ ہم اس سعادت سے کیوں محروم ہو گئے۔ یہ نمونے کم سے کم ایک دو صدی تو چلنے چاہیئے تھے تاکہ عوام میں اچھی طرح ان کی اشاعت ہو جاتی۔ لہذا حضرتؐ نے یہ ذمہ داری اپنے اہلبیت کی سپردگی اور ان کے ایک ایک عمل کو اپنے عمل کے سانچہ میں ڈھال کر اس عظیم الشان فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ آپ نے فرمایا کہ ہر زمانہ میں میرے اہلبیت میں سے ایک امام زمانہ ہوگا جو اس کو نہ پہچانے گا وہ کفر کی موت مرے گا۔

اسلامی نظام حیات میں حسب ذیل باتوں کو خاص اہمیت دی گئی۔

- ایمان باللہ اور توحید کے اعتقاد کے بعد ما جاء بہ النبیؐ پر ایمان
- قول و فعل میں صداقت
- کسب معاش بطریق حلال
- ظلم و جور سے نفرت
- حقوق اللہ و حقوق الناس کی حفاظت
- فتنہ و فساد سے دوری
- فسق و فجور سے اجتناب
- مکر و زور سے نفرت
- حرام سے پرہیز
- تزکیہ نفس
- عمل میں خلوص
- نیکی سے رغبت بدی سے نفرت
- حکومت میں انصاف
- آپس میں انس و محبت
- عبادت کا شوق

آنحضرتؐ کے بعد اگر یہ نظام حیات باقی رہتا تو یہ دنیا مسلمانوں کے لئے جنت ہوتی اور وہ تفرقہ پیدا نہ ہوتا جس نے اسلام کی اجتماعی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا دیا۔

مگر سوء اتفاق سے اور مسلمانوں کی خود غرضی اور ہوس پرستی سے ایسا نہ ہوا۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ہی اسلامی بندھن ڈھیلے پڑنے شروع ہو گئے۔ اور جاہلیت کی رکی ہوئی آندھی یکایک فضائے اسلامی پر چھا گئی۔ اقوام عرب جس وحشت و بربریت کے بھنور سے نکلی تھیں پھر اسی میں غوطہ کھانے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دین کے تہتر ٹکڑے ہو گئے اور ہر گروہ اپنے مقام پر نجات کا پروانہ لے کر بیٹھ گیا۔ کل حزب بما لدیہم فرحون۔

آنحضرتؐ کے بعد اسلام پر کیا گزری؟

یہ بڑی دلدوز۔ روح فرسا اور عبرت سے بھری ہوئی داستان ہے اور اتنی طولانی کہ سالہا سال اس کے بیان کرنے کے لئے درکار ہیں۔

آنحضرتؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی پہلی زبردست چوٹ نو اسلام کے سینہ پر یہ پڑی کہ مسلمان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ منصوص من اللہ خلافت کا حامی تھا اور سوائے حضرت علیؑ کے اور کسی کو آنحضرتؐ کا جانشین ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ دوسرا گروہ منصب خلافت کو خاندان رسولؐ سے نکال کر عوام الناس میں پہونچانا چاہتا تھا اور جو خدا و رسول کا فرض تھا وہ اُمت کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ پہلے گروہ کا مقصد حاصل نہ ہوا اور دوسرے گروہ نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں بیٹھ کر حسب طرح بنا اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ رسولؐ کے وہ تمام اعلانات جو ولایت امیرالمومنینؑ کے متعلق تھے بے اثر ہو کر رہ گئے۔

نظام اسلامی کی ایک اہم دفعہ یہ بھی تھی کہ لا تفسدوا فی الارض تمدن میں امن و اماں کو قائم رکھو۔ اگر امیرالمومنینؑ اس وقت حصول حق کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے اور تلواریں نیاموں سے نکل آتیں تو وہ کشت و خون ہوتا کہ مدینہ کے گلی کوچوں میں خون کا سیلاب نظر آتا اور خدا جانے انتقام کی آندھیاں کہاں سے کہاں تک پھیلتیں۔

مگر امیرالمومنینؑ میں اور عام لوگوں میں یہی فرق تھا کہ وہ جذبات کی زد میں بہنے والے اور اپنے فائدہ پر اسلامی مفاد کو قربان کرنے والے نہ تھے۔ انہوں

نے بہت جلد موقع کی نزاکت کو سمجھ لیا اور اپنے جائز حق سے دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

کوئی نہ سمجھے یا سمجھ کر نظر انداز کر دے یہ دوسری بات ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ امیر المومنین نے اسلام کی اتنی عظیم الشان خدمت انجام دی ہے جو کسی دوسرے سے بن ہی نہ پڑتی۔ اس وقت کی جنگ اسلامی وقار کے لئے موت کا پیغام بن جاتی۔ ہوتا یہ

- ایسے مسلمان جو نفاق کو دل میں چھپائے ہوئے تھے اس نازک موقع سے فائدہ اٹھا کر اسلامی تخریب کا منصوبہ پورا کر لیتے۔
- ایسے مسلمان جو لوٹ مار کے شیدائی تھے اسلامی بستیوں میں ہل چل مچا دیتے۔
- ایسے مسلمان جنہوں نے ابھی تک حقائق اسلام کو سمجھا ہی نہ تھا اسلام سے دست کش ہو کر اپنے آبائی دین کی طرف پلٹ جاتے
- ایسے مسلمان جو یہود و نصاریٰ سے ربط ضبط رکھتے تھے مسلمانوں کی تباہ حالی اور باہمی کشمکش دیکھ کر یہودیوں اور نصرانیوں میں جذب ہو جاتے۔
- یہودی۔ نصرانی اور بت پرست جن کے دلوں میں اسلامی ترقی خار کی طرح کھٹک رہی تھی اور اپنے کو کمزور پا کر اسلامی حکومت کی رعایا بن بیٹھے تھے۔ اس تفرقہ پردازی سے فائدہ اٹھا کر اپنے گئے اقتدار کو واپس لانے کی کوشش کرتے
- جن لوگوں کو یہ باور کرایا گیا تھا کہ اسلام ایک روحانی مذہب ہے اور مال و دولت دنیا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ آج یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے کہ حکومت حاصل کرنے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا۔ دیکھو بانی اسلام کے مرتے ہی

مسلمانوں کی خودغرضیاں و جاہ پسندیاں کیسا رنگ لا رہی ہیں جو کل بھائی بھائی بنے ہوئے تھے آج ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ فتنہ و فساد کی یہ خبریں جہاں جہاں پہونچتیں اسلامی ساکھ ختم ہوتی چلی جاتی۔

یہ تھی وہ زبردست مصلحت کہ فاتح بدر و احد و خندق و خیبر اسد اللہ الغالب نے تلوار نہ اٹھائی اور اس حالت میں بسر کرنا گوارا کیا و فی العین قذی و فی الحلق لشجیٰ۔ کیا علیؑ کی یہ بے مثل اسلامی خدمت بھلا دینے کی قابل تھی؟ تعصب کمشی بھلا سکتی ہے تو بھلا دے مگر اسلامی تاریخ کے سینہ پر علیؑ کے اس احسان کے نقش اتنے گہرے ہیں کہ قیامت تک مٹ نہیں سکتے۔

اب دوسری خدمت پر ایک نظر ڈالئے

سقیفائی حکومتوں کی مجلس مشاورت کا ممبر بننا علیؑ نے گوارا نہ کیا کیونکہ ہر حکومت جس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی علیؑ اس کو اسلامی نقطہ نظر سے جائز نہیں جانتے تھے۔ ایسی حالت میں ارباب حل و عقد کی رائے پر صاد کرنا بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ اسلامی احکام پر کوئی کاری ضرب پڑتی ہو اپنی اس ذمہ داری کو نظر انداز کر دینا ہوتا جو خدا و رسولؐ کی طرف سے عاید کر دی گئی تھی۔ اگر علیؑ ہر آواز کے پیچھے دوڑ پڑنے والے بن جاتے تو یہ حدیث بے معنی ہو جاتی الحق مع علی و علی مع الحق اللھم ادر الحق حیث دار۔

ظاہر بینوں کی نظر میں تو یہ اسلام کی کوئی بڑی خدمت نہ تھی مگر گہری نظر رکھنے والے تو ضرور اس خدمت کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر علیؑ نے حکومت کا قلادۂ اطاعت گلے میں ڈال لیا ہوتا تو پھر اس کے ہر قول و عمل پر امنّا

صدقنا کہنا علی کا فرض ہو جاتا مثلاً حکومت حج تمتع اور متعۃ النسا کی حرمت کے احکام جاری کرتی علی کا فرض ہوتا کہ اس رائے پر صاد کر دیں۔ حکمراں کہتا نماز تراویح واجب ہے علی کو مان لینا لازم ہوتا۔ اس صورت میں علی اور قرآن کا ساتھ چھوٹ جاتا اور رسول کا اعتماد علی پر سے رخصت ہو جاتا۔ رسولؐ کی حدیثیں ان پر غضب آلود نگاہیں ڈالتیں۔

اور اگر علی کی فرض شناسی قبول کرنے سے انکار کر دیتی تو پھر یا تو جان کی خیر نہ تھی یا بذلت تمام مجلس مشاورت سے علیحدگی۔ لہٰذا بہتر صورت یہی تھی کہ اپنے کو علیحدہ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو یہ پتہ چلتا رہے کہ جو احکام جاری کئے جا رہے ہیں علی اور ان کا گروہ قرآن و حدیث کی رو سے ان کو جائز نہیں جانتا اس صورت میں رسولؐ نے تحفظ اسلام کا جو بندوبست کیا تھا وہ اپنے مقام پر باقی رہتا۔ کوئی مانے یا نہ مانے ہم تو اس کو اتنا بڑا احسان سمجھتے ہیں کہ اسلام کی بقا کا اس پر انحصار تھا۔

سب سے بڑی مصیبت اسلام پر یہ آئی کہ آنحضرتؐ کی وفات کے چند سال بعد ہی فتوحات ملکی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم اس پر تو کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے کہ جائز تھا یا ناجائز۔ بلکہ تھوڑی سی روشنی اس پر ڈالنا چاہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں اسلام پر کیا گزری۔

ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ ہو گیا۔ اسلامی حکومت کا دائرہ امید سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ چار دانگ عالم سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ لیکن اس رنگ میں جو بھنک ملی وہ یہ ہے

کہ اسلامی احکام مسخ ہو کر رہ گئے۔ مختصر بیان اس کا یہ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ عرب کے لوگ بالخصوص بادیہ نشین قبایل سخت جنگجو اور سفاک تھے۔ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ خونریزی اور غارتگری تھا وہ اس معاملہ میں ایسے نڈر اور بے باک تھے کہ ذرا ذرا سے جھگڑے پر برسوں تلوار چلتی تھی یہ اسلامی تعلیم کی برکت تھی کہ ان کی باہمی عداوت انس و محبت سے بدل گئی قرآن بتا رہا ہے کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ یعنی وحشت و بربریت کی راہ سے ہٹ کر ان کے خیالات انسانیت کی شاہراہ پر آ گئے اور سخت دلی نرم دلی سے۔ کینہ توزی صفائے قلب سے اور دنیا پرستی دینداری سے بدل گئی

لیکن فتوحات ملکی کے سلسلہ میں جب یلغار کرتے ہوئے عرب سے آگے بڑھے تو رکے ہوئے سیلاب کا یکایک بند ٹوٹ گیا اور جاہلیت کا دور پھر اپنے پرانے افسانے دہرانے لگا۔

ان کی بہادری اور فنون جنگ کی مہارت سے انکار کون کر سکتا ہے جس طرف دھاوا بول دیا۔ خون کے دریا بہا دئیے۔ لاشوں کی ناہموار سطح پر گھوڑے دوڑا دئیے۔ آبادیوں میں لوٹ مار مچاتے۔ بستیوں میں آگ لگاتے۔ گلزاروں کو چٹیل میدان بناتے کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ آج شام میں تھے تو کل مصر میں اگلے دن ایران میں اس جانفشانی اور تیغ زنی کے نتیجہ میں ممالک اس طرح سمٹ کر ان کے قبضہ میں آگئے جیسے مچھیروں کے جال میں مچھلیاں۔

اس غیر متوقع فتوحات کے سلسلہ میں اتنی دولت اور ساز و سامان ان کے

ہاتھ آیا جو خواب میں بھی نہ دیکھا تھا۔ اب کیا تھا دن عید تھا اور رات شب برات۔ چرمی خیموں میں رہنے والے۔ پشمینہ کا کھُردرا بد قطع لباس پہننے والے۔ کمبلوں میں پیوند پر پیوند لگانے والے۔ زرنگار شاہی محلوں میں سونے چاندی کی مسندوں پر حریر دیبا کا لباس زیب تن کئے داد عیش و نشاط دے رہے تھے۔ رامشگران زہد فریب حسینان فتنہ سامان ان کے درباروں میں رقص کناں تھیں۔

دولت کے دلفریب جلوؤں۔ عیش و عشرت کے ساحرانہ کرشموں اور سیم و زر کی بہتات نے ان کے دل و دماغ کی کایا پلٹ دی۔ اب دین کی بجائے وہ حسن دنیا کے عاشق زار اور نفس پرستی اور ہوس رانی کے پرستار تھے۔

ان زہد شکن رنگ رلیوں میں اسلامی زہد و ورع کسے یاد آتا تھا۔ عیش و طرب کی اس گرم بازاری میں اسلامی فقر کو کون منہ لگاتا تھا۔ اسلام کا بے کیف نظام گلدستہ طاق نسیاں تھا۔ زندگی کا وہ سکڑا ہوا راستہ جس سے نکال کر شریعت محمدی لے جانا چاہتی اب تن پروری کو تپ دق کی بیماری نظر آتا تھا۔ اول تو کثرت ایسے لوگوں کی تھی جن کو حقائقِ اسلامی پر پوری طرح عبور ہی نہ تھا اس کی روحانی فضا میں مشکل سے دو چار سانس لینے پائے ہوں گے۔ اور جن لوگوں کو تھوڑا بہت آتا تھا ان زلزلوں کے خوفناک جھٹکوں میں وہ بھی دماغ سے نکل گیا۔ اسی کا رونا تو حضرت انس ابن مالک نے رویا تھا جس کو بخاری شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں نے دمشق میں انس بن مالک کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تو اس کا سبب پوچھا فرمایا اس پر رو رہا ہوں کہ اب اسلام کی کوئی بات میں نہیں پاتا۔ پوچھنے والے نے کہا کیا نماز بھی نہیں فرمایا ہاں نماز بھی ضائع ہو گئی

کاش یہ بلا انفرادی یا اجتماعی اعمال ہی پر آئی ہوتی۔ غضب تو یہ آیا کہ اسلامی عقائد بھی اس سیلاب میں بہ گئے اور احکام خداوندی اور تعلیم محمدی میں کتر بیونت بھی شروع ہوگئی۔

عام قاعدہ ہے کہ جب فاتح اور مفتوح قوموں میں اختلاط و ارتباط کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو ایک کے خیالات کا اثر دوسرے پر پڑتا ہی ہے۔ رسم و رواج و طریق ماند و بود میں تبدیلیاں ہوتی ہی ہیں۔ مباحثوں اور مناظروں کے دروازے کھلتے ہی ہیں۔ ایک فریق دوسرے فریق پر اپنے عقاید کا رنگ جمانے کے لئے جی توڑ کر کوشش کیا ہی کرتا ہے۔ یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جن ممالک کو فتح کیا تھا ان میں مختلف قوموں کے فلسفے نظام حیات کو سنبھالے ہوئے تھے۔ روم و ایران و مصر و یونان میں آفتاب علم عرب سے ہزارہا برس پہلے اپنی ضو فشانی کرتا چلا آ رہا تھا۔ بالخصوص یونان جو علوم و فنون کا گہوارہ کہا جاتا تھا۔ بڑے بڑے روشن دماغ فلاسفر اور عالی خیال حکما اپنے اپنے نظریات اور اعتقادات کے طلسمی قلعے کھڑے کر گئے تھے۔ فیثاغورث۔ بقراط۔ سقراط۔ افلاطون ارسطو اس ملک کی مایہ ناز ہستیاں تھیں۔ ان کے فلسفے انسانی دل و دماغ پر سیاہ بادلوں کی طرح چھائے ہوئے تھے۔

اسی طرح ایران میں زردشتی۔ مزدکی۔ مانوی فلسفے اپنا زور باندھ رہے تھے ہندوستان میں بودھ مت اور ہندو ازم اپنے اعتقادات کے جال میں دنیا کو پھانسنا چاہ رہا تھا۔

ان طوفان خیز سمندروں میں عرب کے سپاہی آ گودے ان بیچاروں کے

پاس تلوار کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسلامی حقائق سے اگر کچھ لگاؤ تھا بھی تو ایسا جیسے آٹے میں نمک۔ الٰہیات فلکیات۔ عنصریات اخلاقیات وجدانیات روحانیات۔ تمدنی اور معاشرتی نظام وغیرہ بے شمار مسائل تھے جن پر ان اولوالعزم فاتحین کو ابھی تک اس لئے غور و فکر کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ قرآن و حدیث پر ان کی گہری نظر ہی نہ تھی یہ تو لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کے زور پر فتوحات کے ڈنکے بجاتے چلے گئے تھے۔

برخلاف اس کے جو لوگ ان کے مد مقابل تھے وہ اس سمندر کے نامور تیراک اور اس میدان کے تجربہ کار نبرد آزما تھے۔ لہٰذا جہاں یہ پہنچے وہ خم ٹھوک کر سامنے آکھڑے ہوئے۔ اور ہر طرف سے دل و دماغ پر چھاپے مارنے شروع کر دئے۔ پہلی ہی زور آزمائی میں یہ چاروں شانے چت نظر آئے۔ اُنھوں نے تو تلواریں سروں پر چمکا کے ان سے کلمہ پڑھوایا تھا مگر انھوں نے باتوں باتوں میں اپنے عقائد کا کلمہ پڑھوا لیا۔ انھوں نے اُن کا ملک فتح کر لیا انھوں نے دل و دماغ فتح کر لئے۔ انتہا یہ ہے کہ ان کی مایۂ ناز کائنات (توحید) بھی اس غارت گری میں لٹ گئی۔ اور پھر تو اسلامی عقائد میں وہ ہل چل پڑی کہ سننے والوں کا ایمان تھرا گیا۔ کوئی ایک عقیدہ بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہا۔

اب جو ادہر سے مال و دولت میں لدے پھندے پلٹے تو اپنے عقائد کا دوالہ نکالے ہوئے۔ اپنا سرمایہ نیلام پر چڑہائے ہوئے۔ اب ان کے عقائد پر یہ مثال صادق آرہی تھی۔ ”کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھانمتی نے کنبہ جوڑا۔“

یہی وہ چیز تھی جس نے ایک دین کے تہتر ٹکڑے کئے اور ان کے عقائد میں اختلاف پیدا ہو گیا۔

عقائدِ اسلام میں تبدیلیاں

اب مختصر سا حال اس تبدیلی کا بھی سن لیجئے اور اسلام کی تباہی پر دو آنسو بہا لیجئے۔

(۱) الٰہیات

(۱) خدا کے ساتھ مادہ بھی قدیم ہے کہ نہ ہو تو کاری گری کا وجود بیکار۔ (یہ بلا یونانیوں اور ہندوؤں کی طرف سے آئی۔ ورنہ اسلام تو سوائے خدا کے اور کسی کو قدیم مانتا ہی نہیں۔)

(۲) خدا قابل رویت ہے۔ یہ بھی یونانیوں اور بت پرستوں کے عقیدہ کا آئینہ بردار ہے۔ ورنہ اسلامی تعلیم تو یہ ہے لا تدرکہ الابصار و ہو یدرک الابصار و ہو اللطیف الخبیر۔ (کوئی بینائی اس کو نہیں پا سکتی ہاں وہ سب بینائیوں کا ادراک کرتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے) اسی عقیدہ کو لے کر اسلام کا ایک فرقہ رویت کا قائل ہو گیا

(۳) صفات باری تعالیٰ زائد بر ذات ہیں (یہ یہودیوں کی ہمنوائی ہے)

(۴) خدا کے لئے حلول روا ہے۔ (یہ ہندوؤں کی طرف سے آیا ہوا پرشاد ہے کیونکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے ہر دیوتا میں خدا حلول کئے ہوئے تھا۔)

(۵) بندہ اپنے افعال میں مجبور ہے خدا جو چاہتا ہے کراتا ہے (مزدکی فلسفہ کی تائید)

(۶) خدا نے مقدر میں جو کچھ لکھ دیا ہے بندہ اس کے کرنے پر مجبور ہے (چین کے مشہور ریفارمر چانکیہ کا فلسفہ)

(۷) مرنے کے بعد بندہ کا وصل خدا سے ہو جاتا ہے (بودھ کا فلسفہ مکتی نامے)

(۸) خدا ہر شے میں سمایا ہوا ہے (ہمہ ست) (ہندو فلسفہ کا پرتو)

(۹) خدا اپنی قدرت کا تماشہ دیکھنے خود بازار عالم میں آیا ایک صوفی صاحب فرماتے ہیں ؎

آستین بر رو کشیدہ ہمچو مکار آمدی۔

باخودی خود در تماشا سوئے بازار آمدی

(یونانی عقیدہ بتاتا ہے کہ خدا ہفتہ میں ایک بار کوہ اولمپس پر آتا ہے اور اپنی مخلوق کو دیکھ کر خوشی میں رقص کرتا ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ ڈلفی کی کاہنہ کے اندر حلول کر جاتا تھا)

(۱۰) خدا کے لئے عدل ضروری نہیں۔ وہ نکوکاروں کو جہنم میں اور بدکاروں کو جنت میں اپنی قدرت کا تماشہ دکھانے کے لئے بھیج سکتا ہے۔

(۱۱) خدا کا کلام قدیم ہے حادث نہیں

(۱۲) خدا خالق خیر و شر دونوں ہے

(۱۳) خدا جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے بندہ اپنے افعال میں مجبور ہے۔

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

چاہتے ہیں سو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا

(۱۴) خدا صاحب جسم ہے انسان کی طرح اس کے بھی ہر عضو ہے۔

یہ ہے الٰہیات کے متعلق وہ طوفان ضلالت جس نے مسلمانوں کو یکایک اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ان عقاید کی اگر آپ تفصیل دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ پتہ لگانا

چاہتے ہیں کہ اسلام کے تہتر فرقوں میں کس عقیدہ والے کا کیا نام ہے اور اس فرقہ کا رہنما کون ہے تو شہرستانی کی کتاب ملل ونحل کا مطالعہ فرمالیجئے۔

کیا آپ کو یہ سنکر تعجب نہ ہوگا کہ اس نئے رنگ میں رنگے جانے والوں نے ان مشرکانہ اور ملحدانہ عقائد کو قبول کرنے کے بعد پھر اس کی بھی کوشش کی ہے کہ اسے قرآن مجید سے صحیح ثابت کردیں۔ ہر فرقہ اپنی صداقت کے ثبوت میں قرآن کو پیش کررہا ہے۔ کیا ایسی صورت میں آپ صرف قرآن کو ہدایت کے لئے کافی سمجھیں گے؟ اسی ضرورت کو محسوس کرکے رسولؐ نے اپنے اہلبیت کو قرآن کے ساتھ کیا تھا۔

---

(۲) ملائکہ

(۱) ملائکہ فرضی وجود ہیں۔ انسان کی نیک قوتوں کا نام ملائکہ ہے اور بد کا شیطان (ملاحظہ ہو سرسید آنجہانی کی تفسیر انوار القرآن پ۱)

(۲) ملائکہ کی شکل عورتوں کی سی ہے۔

(۳) ملائکہ انسانوں سے افضل ہیں۔

(۴) شیطان ملائکہ میں سے تھا

(۳) روح

(۱) مادہ کی طرح روح بھی قدیم ہے۔

(۲) روح کے لئے تناسخ ہے ؎

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام ۔۔۔ یک ہزار و ہفت قالب دیدہ ام

(۳) روح خدا سے نکلی ہے اور خدا سے جا ملے گی۔ اس کا نام وصل ہے۔

(۴) جنت میں صرف روح جائے گی نہ کہ مادی بدن

(۴) جنت و دوزخ

(۱) جنت و دوزخ قیامت کے بعد پیدا ہوں گے۔

(۲) جنت کوی مقام نہیں صرف روحانی کیف کا نام ہے۔

(۳) جنت خوشنودی خدا کا نام ہے اور دوزخ اس کے عذاب کا۔

(۵) نبوت

(۱) نبی ہم ہی جیسا انسان ہے علم وفہم میں عام لوگوں سے ذرا زیادہ ہوتا ہے۔

(۲) وحی نبی کے دل کی خود آواز ہوتی ہے

(۳) نبی کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں۔ وہ گناہ کرتا ہے۔

(۴) نبی کے ہر حکم کی تعمیل فرض نہیں۔

(۵) نبوت وحکومت دو جداگانہ چیزیں ہیں جہاں تک نبوت کا تعلق ہے نبی کی مخالفت ممنوع جہاں سے حکومت کا تعلق ہے مخالفت جائز

(۶) نبی اپنی خواہش نفسانی سے بھی احکام دے سکتا ہے۔

(۷) نبی کو ہذیان ہو سکتا ہے۔

(۸) نبی سہواً کلمہ کفر کہہ سکتا ہے جیسا کہ آنحضرتؐ نے افرئیتم اللات والعزیٰ والمناۃ الثالثۃ الاُخریٰ کے بعد نماز میں تلک الغرانیق الاُولیٰ اِن شفاعتھن لترتجیٰ کہدیا تھا۔

(۶) امامت

(۱) رسول کا خلیفہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ امت خود بناتی ہے۔

(۲) امام کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں۔

(۳) اسلام میں سلطنت جمہوری ہے نہ کہ نصی و شخصی۔ اس کے لئے کسی امام مخصوص کی ضرورت نہیں۔

(۴) اسلامی خلیفہ شرعی احکام کو تبدیل کر سکتا ہے۔

مشتے نمونہ از خروارے یہ چند موٹی موٹی باتیں ہم نے بیان کر دی ہیں۔ اب آپ غور فرمائیں کہ جب اقوام عالم کے عقائد اس طرح اسلام پر چھا گئے تو پھر اسلام میں روحانیت رہی کہاں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان تغیرات کی طرف سلاطین نے تو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر کوئی توجہ کی ہی نہیں رہے صحابہ کرام اور علمائے عظام انھوں نے اس زنگ کو کیونکر دور کیا۔ اور اسلام کی رگوں سے اس زہر کو کیسے نکالا۔

اگر یہ سب عقائد درست ہیں تو پھر یہ کوئی دوسرا اسلام ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلیم کردہ نہیں اور اگر یہ عقائد قرآن و حدیث کے خلاف ہیں تو ان کی رد کرنے والوں کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔

آپ فوراً جواب دیں گے کہ اسلام کے علمائے ان عقائد کے ابطال میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ میں کہتا ہوں کون سے فرقہ کے علماء کو آپ اس تردید اور انسداد فتنہ کا ذمہ دار بناتے ہیں۔ اسلام میں تو تہتر فرقے ہیں اور یہ فرقے عقائد کے اختلاف ہی کی بنا پر بنے ہیں۔ پس جب ایک فرقہ دوسرے کے

عقائد کی تردید کر رہا ہے تو آپ کو کیا حق ہے کہ ایک کو صحیح راہ پر سمجھیں اور دوسرے کو غلط راستہ پر۔ قرآن سے ثبوت ہر ایک کے پاس ہے۔ حدیث کی تائید ہر ایک کے ساتھ ہے۔ پھر کیا وجہ کہ ایک کو حق پر سمجھیں اور دوسرے کو گمراہ۔ یہ آویزش پہلی صدی ہی سے چلی آ رہی ہے۔ اگر علما اس گتھی کو سلجھا سکتے تو تہتر راہیں مٹ کر وہی ایک راہ ہو جاتی جو رسولؐ نے بتائی تھی۔

آپ اس کا کوئی جواب قیامت تک نہیں دے سکتے۔

ہاں ہمارے پاس اس کا جواب ہے وہ یہ کہ ہم کسی غیر معصوم کے کسی عقیدہ پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ اس کی کسی تعلیم پر آمنا وصدقنا کہتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ہر قسم کی غلطی کا امکان ہے۔ وہ قرآن کی صحیح تفسیر و تاویل بیان کرنے کا ذمہ دار نہیں۔ اس پر کسی حدیث کے صحیح سمجھنے کا ہم کو یقین نہیں۔ کیونکہ خدا و رسولؐ نے اس کو ہدایت کا ذمہ دار نہیں بنایا۔ یہ ذمہ داری صرف اہلبیت رسولؐ پر عائد کی گئی ہے۔ وہی قرآن کے ساتھ کئے گئے ہیں انہی سے تمسک کو ذریعہ نجات بتایا گیا ہے۔

مذکورہ بالا عقائد اسلامی دنیا میں پھیلتے چلے گئے مگر کسی حکمران کو اس کا خیال نہ آیا کہ اس کی روک تھام کرنی ضروری ہے جب حکام خود اپنا عقیدہ وہی بنائے ہوئے تھے تو ان کو کیا ضرورت تھی کہ ان کے خلاف ایکشن لیں بلکہ بہت سے سیاسی مصالح کی بنا پر وہ بعض عقائد کو پوری طرح رواج دینے کے حق میں تھے۔ ان کو غرض حکومت سے تھی نہ کہ اسلام کی زندگی اور موت سے۔

البتہ جن کے دلوں میں اسلام کا درد تھا جو اسلام کے محافظ و نگہبان بنائے

گئے تھے جن کے گھر سے اسلام نکلا تھا۔ جن کی کوششوں سے پروان چڑھا تھا۔ وہ یہ تبدیلیاں دیکھ کر تڑپ گئے اور جس طرح ان سے ممکن ہوا اسلام کی نصرت کرتے رہے

تاریخ آپ کو بتائے گی کہ امیر المومنین علیہ السلام کے ہاتھ میں جب اسلامی حکومت کی زمام آئی تو آپ نے اپنا یہ معمول بنایا کہ بعد نماز ظہر مسجد کوفہ میں روزانہ دینی مسائل بیان فرمانے لگے۔ آپ سے پہلے کسی حکمران کو یہ توفیق نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی تعلیم کا یہ بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ یہ درحقیقت علاج تھا اسی تپ دق کا جو ملکی فتوحات کے سلسلہ میں مسلمانوں کو عارض ہوگئی تھی۔ امیر المومنینؑ کے خطبوں کو بغور پڑھو تو پتہ چلے کہ آپ نے الٰہیات کے کیسے دقیق مسائل حل کئے ہیں۔ فطرت انسانی کے کیسے گہرے راز سمجھائے ہیں۔ دنیا کی حقیقت کو کس خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ اسی طرح قرآن۔ نبوت۔ قیامت۔ نظام حیات انسانی۔ موت۔ جنت۔ دوزخ وغیرہ تمام عقیدوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس کا بڑا مقصد یہی تھا کہ مسلمان اقوام غیر کے اختلاط سے جو زہر اپنے عقاید کے پیکر میں پیوست کر کے آگئے ہیں۔ یا یہودیوں، نصرانیوں اور ملحدوں کے میل جول سے جو گمراہیاں پیدا ہوگئی ہیں یا حکومتوں کے جو قوانین دوسروں کی دیکھا دیکھی بدلے گئے ہیں ان سب کی اصلاح ہوجائے اور تمام اسلامی ممالک میں اسلامی نظام حکومت کو رواج ہو۔ قیصر و کسریٰ کے آئین حکومت کی دراندازی نہ ہونے پائے۔ الوہی سیاست کے جو قواعد و ضوابط مسلمان حکمرانوں نے پس پشت ڈال دئے ہیں وہ پھر ان کے سامنے آجائیں۔

آپ نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ مسلمانوں کو صحیح عقائد تعلیم فرماتے ہوں بلکہ آپ نے دشمنان اسلام سے مناظرے بھی کئے۔ یہودیوں۔ نصرانیوں۔ مجوسیوں اور

ملحدوں کے اعتراضات کے جوابات بھی اپنے خطبوں اور تقریروں میں دیئے اور ان کو زیر کیا۔ بہت سوں نے اسلام قبول کیا اور جن پر شقاوت سوار تھی وہ اپنی ہٹ پر جمے رہے ہم نے اپنی کتاب عقائد اسلام مطبوعہ ادارہ معارف اسلام لاہور میں۔ امیرالمومنین اور دیگر معصومین کے خطبوں کے بعض حصے بیان کر کے یہ دکھایا ہے کہ ان عقائد باطلہ کی تردید وقتاً فوقتاً یہ حضرات کرتے رہے اس مختصر رسالہ میں ان کی تفصیل باعث طوالت ہے۔ اگر یہ خطبے بیاں نہ ہوتے تو آج مسلمانوں کو اسلام کے صحیح نقوش اور اصلی خدوخال کا پتہ چلنا دشوار ہو جاتا۔ چونکہ یہ سب معصوم تھے اور رسول کی طرف سے ذمہ دار بنائے ہوئے لہذا انہوں نے جو عقاید ہم کو تعلیم دیئے وہی صحیح ہو سکتے ہیں دوسروں کے غیر ذمہ دارانہ قول پر اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا۔

دنیا نے ان کی تعلیم کو نہ مانا تو نہ مانے جو خدا اور رسولؑ کا منشا تھا وہ پورا ہو گیا جب تک ان کے خطبے ان کی حدیثیں دنیا میں باقی رہیں گی اسلام کی اصلی صورت مسلمانوں کے سامنے آتی رہے گی۔

اگر مسلمان سمجھیں تو یہ ایسا معمولی احسان نہیں جسے آسانی سے بھلا دیا جائے

عقائد کے ساتھ ساتھ ان حضرات کو عمل کی درستی کی بھی فکر تھی۔ لہذا ہر زمانہ کے لوگوں کو انہوں نے اپنے عمل کے نمونے پیش کر کے غلط طریقے سے بچانا چاہا۔ جتنے احکام عبادات سے متعلق تھے ان کو خود بجا لا کر دکھایا۔ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق تھا۔ انہوں نے اپنے حسن خلق کے نمونے پیش کیے۔ معاشرت کے صحیح اصول پر کاربند ہو کر دکھایا۔ تمدن کے اصلاح کے لئے جو امور مفید ہو سکتے تھے وہ سب لوگوں کو بتائے اور عمل کر کے دکھلائے۔ ہر زمانہ میں آخرت کی طرف توجہ دلائی۔ یہی وہ

ذمہ داریاں تھیں جن کو ادا کرنے کے لئے ان کو رسولؐ نے اپنا قائم مقام بنایا تھا۔ خود غرض اور نفس پرست ابنائے روزگار نے ان کو پوری طرح ہدایت کرنے کا موقع ہی نہ دیا اس لئے جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کا بالکلیہ ازالہ نہ ہو سکا۔

اسلام کا سیاسی نظام

آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل ملک عرب میں دو ملکوں کے قانون چل رہے تھے۔ ایک رومیوں کا دوسرے ایرانیوں کا۔ یہ ایسے ہی قانون تھے جیسے عام طور پر ملکی قانون ہوا کرتے ہیں جن میں رعایا کے حقوق کا کم اور سلاطین کے حقوق کا زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے۔ جن میں بادشاہ رعایا سے ایک جدا مخلوق سمجھا جاتا ہے اور اس کے اختیارات اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ رعایا کی جان و مال و آبرو سب اس کے قدموں میں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اسلامی سیاست کا قانون ان سب قانونوں سے الگ تھا۔ وہاں حقوق الناس کی حفاظت کا پورا بندوبست تھا۔ وہاں بادشاہ نہ کسی قصر زرنگار کا مالک تھا۔ نہ تاج وتخت کا دارا۔ نہ ملکی خزانے کا وارث۔ عام رعایا کی طرح وہ بھی خدا کا ایک بندہ تھا اس کا فرض یہ تھا کہ اپنی رعایا کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ تمدن میں امن و امان کو قائم رکھے۔ ظالموں کو ظلم سے روکے حدود مملکت کو دشمنوں سے بچائے۔ عدل و انصاف سے رعایا کے قضایا کو فیصل کرے۔ ہر فریادرس کی فریاد کو کان لگا کر سنے۔ اس کے دربار میں چوکی پہرہ نہ ہوتا کہ ہر مظلوم آسانی سے اس تک پہونچ سکے۔ بیت المال

میں جو مال آئے اس کو تمام مسلمانوں پر ان کے مدارج کے لحاظ سے تقسیم کرے۔ اپنے قبضہ میں رکھنے کا اس کو کوئی حق نہ ہو۔ محاصل ملکی کے حصول میں جبر و تشدد کو راہ نہ دے حکام کو رشوت خواری اور ظلم پسندی سے سختی کے ساتھ روکے۔ عام لوگوں کی طرح رعایا میں گشت لگا کر ان کے حالات معلوم کرے۔ بیووں۔ یتیموں اور مسکینوں کی امداد کرے۔ خود تکلیف اٹھائے مگر رعایا کو ننگا بھوکا نہ رکھے۔ قوانین الٰہیہ کا سختی سے پابند ہو۔ کسی قوم پر جارحانہ انداز میں فوج کشی نہ کرے۔

مختصراً یہ تھی سیاست الٰہیہ اور ریاست نبویہ۔ آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ ان کے بعد بھی یہی نظام سلطنت قائم رہے لیکن حضرتؐ کا یہ مقصد پورا نہ ہوا۔ اسلامی قوانین کی جگہ ایرانی۔ یونانی اور رومی قوانین سلطنت نے لے لی اور حکمران وہی سب کچھ کرنے لگے جو عموماً دنیوی سیاست میں ہوا کرتا ہے۔

امیر المومنینؑ کا عہدِ حکومت

امیر المومنین کے عہد حکومت تک پہنچتے پہنچتے اسلامی سیاست اس حد پر آ لگی تھی کہ آنحضرتؐ کو زمام حکومت ہاتھ میں لینے میں تامل ہوا آپ سمجھتے تھے کہ جو طبیعتیں غلط راستہ پر چلنے کی عادی ہو گئی ہیں وہ اب اس سیاست کو ہرگز پسند نہ کریں گی جس کو مطابق قرآن و حدیث میں چلانا چاہوں گا۔ حضرت کا یہ اندیشہ غلط نہ تھا جو خطرہ تھا ؤ بیعت ہوتے ہی سامنے آ گیا۔ آپ نے ہر چند انکار کیا مگر لوگوں نے ایسا ہجوم کیا اور اس طرح پل پڑے کہ آپ کو اپنی ہلاکت کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ بہر حال ایک مدت دراز کے بعد جب حق اپنے مرکز کی طرف لوٹا وہ آپ کی

ت پر لوگوں کا اجماع ہو گیا۔ تو آپ نے سیاست مروجہ سے کنارہ کش ہو کر اپنی
ست کی بنیادیں استوار کرنا چاہیں لیکن خود غرضوں، نفس پرستوں اور
رت پسندیوں کو یہ حکومت آنکھ دیکھی نہ بھائی کیونکہ اس حکومت میں ان کو
ق العنانی کے گلے میں پھانسی کا پھندا نظر آیا۔ ہوس رانی اور ظلم پسندی کو
دھوپ کے لئے میدان تنگ دکھائی دیا۔ رشوت خواروں اور تن آسانوں
پنی جانیں خطرہ میں نظر آئیں۔ چند ہی روز کے بعد سب کی سمجھ میں یہ بات آگئی
ہ حکمران نہ خود کھائے گا نہ دوسروں کو کھانے دیگا۔ جو جہانبانی کرنے والا
کھے ٹکڑے کھائے گا اور لباس میں پیوند پر پیوند لگائے گا۔ بوریے پر بیٹھ
عاملات چکائے گا وہ بھلا حرص و ہوا کے بھوتوں کو اپنے دربار میں کیوں
دے گا۔ چنانچہ ایک بزرگ نے بیعت اس لئے توڑ دی کہ وہ بصرہ کی حکومت
رہے تھے مگر امیر المومنینؑ نے ان کو اس کا اہل نہ سمجھا۔ دوسرے بزرگ کوفہ
ورنری کے خواہاں تھے ان کی بھی مراد پوری نہ ہوئی۔ خفا ہو کر بیعت
ھنڈا چھوڑ بیٹھا اور بدخواہوں سے سازباز کر کے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔

رشوت خوار حکام جو عرصہ سے مزے اڑا رہے تھے اور رعایا کے حقوق دبائے
تھے یکقلم برخاست کر دئے گئے۔ ایک پارٹی ان کی بھی بن گئی۔ جناب معاویہ
یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ علیؑ کی خلافت میں چوکڑیاں بھرنے کا موقع نہیں مل سکتا
وہ بھی بغاوت کی خاک اڑانے لگے۔

لیکن باوجود ان سخت مخالفتوں کے امیر المومنین کا قدم جہاں تھا وہیں
مغیرہ بن شعبہ و عبداللہ بن عباس وغیرہ نے سیاست کے نشیب و فراز سمجھائے

ہوئے بہت کچھ چاہا کہ جو نظام چلا آرہا ہے امیر المومنین بھی اس کو قائم رکھیں۔ مگر علی علی ہی تھے۔ وہ کہاں ان باتوں میں آنے والے تھے۔ سختی سے ڈانٹ دیا کہ مجھ سے اس کی امید نہ رکھنا۔

اس میں شک نہیں کہ امیر المومنین کو بے انتہا مصائب کا سامنا کرنا پڑا آپ کا تمام عہد حکومت نبرد آزمائیوں میں گزر گیا۔ روز بروز الجھنیں بڑھتی چلی گئیں مگر سیاست الٰہیہ کے جادہ سے ایک قدم آپ کا نہ ہٹا۔

دنیا کہتی ہے علیؑ کو سیاست نہ آتی تھی۔ ہاں وہ رائج الوقت سیاست نہ آتی تھی جس میں بہت سے اینچ پینچ ہوتے ہیں اور جس کی تہوں میں بہت سی ناگنیں لپٹی رہتی ہیں۔ علیؑ تو اس سیاست کے ماہر تھے جو قرآن نے بتائی اور رسولؐ نے سکھائی تھی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں ملکی فتوحات کا دروازہ بند رہا۔ کیا کوئی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ قرآن وحدیث کی رو سے خلیفہ خدا و نائب رسولؐ کا فرض ملکی فتوحات بھی ہے، جارحانہ حملہ کرنے کی بھی اجازت ہے؟

اسلام میں مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں نہیں کہ ہر ایک کے اصول جداگانہ ہوں بلکہ سیاست پر مذہب کا سایہ ہے۔ لہٰذا جو سیاست مذہب کے قانون سے جدا ہوگی وہ اسلامی سیاست کہلانے کی مستحق نہیں۔

کوئی صاحب جرأت کر کے امیر المومنین کے سیاسی اصول کو قرآن وحدیث کے مخالف ثابت کر دیں۔ جس کو انشاء اللہ وہ قیامت تک ثابت نہ کر سکیں گے۔

امیر المومنینؑ کا اسلام پر یہ بہت بڑا احسان تھا کہ آپ نے اسلامی سیاست

کے بھولے ہوئے سبق لوگوں کو یاد دلا دئیے۔ یہ ایسے ہلکے نقش نہیں کہ صفحہ روزگار سے مٹانے والے ان کو مٹا دیں جب تک امیر المومنین کے خطبے دنیا میں موجود ہیں جب تک آپ کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو حکام وقت کو لکھے۔ جب تک آپ کے وہ فرمان اپنی جگہ پر قائم ہیں جو آپ نے مختلف صوبوں کے گورنروں کو لکھے جب تک آپ کی وہ خط و کتابت باقی ہے جو آپ کے اور امیر شام کے درمیان ہوئی اس وقت تک کس کی مجال ہے کہ امیر المومنین کی سیاست کو قوانین الٰہیہ کے خلاف بتا سکے۔

تعصب کی زبان کو لگام نہیں دیا جا سکتا۔ عداوت کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جا سکتا لیکن حقیقت کسی کے چھپائے چھپ نہیں سکتی۔

امام حسن علیہ السّلام کا دورِ سلطنت

اگرچہ چھ ماہ کی سلطنت کا زمانہ ہی کیا ہوتا ہے مگر اس مختصر دور میں بھی امام حسن علیہ السلام بھی سیاست کے اسی راستہ پر قائم رہے جو ان کے گھر کا بتایا ہوا تھا۔ امیر معاویہ نے جو سازشوں کا جال ہر طرف بچھا رکھا تھا اس نے امام حسنؑ کے لئیے بے شمار دشواریاں پیدا کر دی تھیں۔ خلافت کے تمام دور میں ایک اطمینانی سانس بھی آپ کو لینا نصیب نہ ہوا لیکن آپ نے اس شدید مخالفت کی قطعاً پروانہ کی اور جو اسلامی نظام تھا اس وقت تک اس کو برقرار رکھا جب تک سلطنت کی باگ آپ کے ہاتھ سے نکلی نہیں۔ اپنے لشکریوں کی نااہلی اور دنیا پرستی سے مجبور ہو کر آپ نے معاویہ سے صلح تو کر لی لیکن نہ اس کی بیعت کی نہ اس کے آئین حکومت کو تسلیم کیا۔ ہاں یہ دکھا دیا کہ اگر دشمن صلح کی طرف ہاتھ بڑھائے تو باوجود

بے شمار خرابیوں کے ہم الصلح خیرٌ سے ہٹنے والے نہیں۔ یہ صلح محض اس لئے منظور
کی گئی کہ ناحق مسلمانوں کا خون نہ بہے اور جہاں تک فتنہ و فساد کو روکا جا سکتا
روکدیا جائے تاکہ کل کو کوئی یہ نہ کہے کہ معاویہ در پے صلح تھا مگر امام حسن اپنی
پر قائم رہے۔ اور صلح جیسی بہتر ین چیز کو ٹھکرا دیا۔ ان حضرات کا یہ خاصہ ہے کہ
دامن عمل پر اس قسم کے دھبے نہیں آنے دیتے۔

جھگڑا صرف سلطنت کا تھا اس کو آپ نے ختم کردیا جیسے ان کے
بزرگوار اپنے حقوق سے دست کش ہو گئے تھے۔ اس عمل سے دنیا نے جان لیا
اہلبیت رسولؐ دنیوی سلطنت و حکومت پر رال نہیں ٹپکاتے۔ اگر یہ حکومت کو
ہاتھ میں لیتے بھی ہیں تو محض خلق اللہ کے حقوق کی نگہداشت کے لئے لیکن اگر
ماحول خراب ہو جائے نفوس میں قبول ہدایت کی صلاحیت باقی نہ رہے تو اس
حکومت پر ٹھوکر مار دیتے ہیں۔

ہدایت کا یہ راستہ بھی اہلبیت رسول ہی کا بتایا ہوا ہے لہذا اسلام
کی یہ خدمت بھی بھلا دینے کی قابل نہیں۔

امام حسینؑ علیہ السلام کا دورِ امامت

امام حسین علیہ السلام اس سلسلہ امامت کی تیسری فرد تھے جن کو رسولؐ نے
قرآن کے ساتھ کیا تھا اور جن سے تمسک رکھنے کو ذریعہ نجات بتایا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کا دور امامت ایک ایسے نازک زمانہ سے شروع
ہوا تھا جبکہ ضلالت و گمراہی کی تاریک گھٹائیں ہر طرف منڈلا رہی تھیں اور دیندار

دنیا پرستی کا دور دورہ ختم ہوتا جارہا تھا۔ بلکہ بقول انس بن مالک ایسا زمانہ آگیا تھا کہ اسلام کی کوئی بات اس میں نہ پائی جاتی تھی حتیٰ کہ نماز بھی ویسی نہ رہی تھی اسلامی قدریں کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی دم توڑ رہی تھیں۔ دینی حقائق تاریک غاروں میں پڑے ہوئے اپنی ناقدری پر رو رہے تھے۔

کیسا نازک دور تھا۔ کیسا خوفناک دور تھا۔ ایمان لرزہ بر اندام تھا اور اسلام دست بہ سینہ۔ یہ یزیدی دور تھا جس نے ارباب ایمان کے لئے زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا تھا۔ حق پسندی مہر بہ دہن تھی اور صداقت کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ صحابہ خاموش تابعین ساکت۔ مخالفت میں جان کا خطرہ۔ موافقت میں ایمان رخصت۔ اس سے زیادہ بُرا وقت شاید ہی اسلام پر آیا ہو۔ یزیدی سطوت و جبروت ایک خونخوار دیو کی طرح برہنہ شمشیر لئے ہر سر پر کھڑی تھی کہ ذرا بولے اور گردن صاف۔

ایسے ہولناک دور میں اسلامی کردار کو جس نے نمایاں کر کے دکھایا وہ صرف امام حسین علیہ السلام کی ذات تھی۔ آپ نے یزیدی سطوت پر ٹھوکر مار کر اسلام کی نصرت پر کمر باندھ لی۔ اگرچہ اس ارادہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے آپ کو بہت بڑی قربانی دینا پڑی بے شمار مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا مگر آپ نے ذرا پرواہ نہ کی اور مدینہ سے کربلا تک ہر ہر قدم پر مسلمانوں کو اسلام کے بھولے ہوئے سبق یاد دلاتے چلے گئے۔

مصائب سے جھجک کر۔ حوادث سے گھبرا کر۔ ایک ظالم و جابر بادشاہ کے زور وطاقت سے ڈر کر۔ آپ نے کسی وقت بھی جادہ راستی سے اپنا ایک قدم بھی بال برابر

نہ ہٹایا جو عزم تھا اسے پورا کیا۔ جو ارادہ کر لیا تھا آخر وقت تک اس پر قائم رہے بھوکے رہے پیاسے رہے۔ خون میں نہلائے۔ گلے کٹوائے۔ گھر لٹوایا۔ ناموس کی بے حرمتی گوارا کی لیکن حق کو باطل کے سامنے جھکنے نہ دیا۔ سر دیدیا مگر ظالم کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیا۔ ایک فاسق و فاجر انسان کی بیعت نہ کی۔

امام حسین علیہ السلام نے جو عجیب و غریب لائحہ عمل ارباب روزگار کے سامنے پیش کیا ہر قوم نے اس کو اپنانے کی کوشش کی۔ دنیائے انسانیت نے ہر طرف سے اس پر صدائے تحسین و آفرین بلند کی۔ ہم واقعہ کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے صرف اتنا کہہ کر اس باب کو ختم کر رہے ہیں کہ اگر اس وقت قرآن کے ساتھ اہلبیت میں سے ایک کا بھی وجود نہ ہوتا تو اسلام کو یزیدیت نے چر لیا تھا۔ اسلام ایک ایسا پیکر بن جاتا جس کی رگ رگ میں کفر و شرک و الحاد و زندقہ کا خون بھرا ہوا ہوتا۔

دنیا حسینؑ کے اس احسان کو بھلا نہیں سکتی اور اگر بھلانا چاہے گی تو ارباب عقل و شعور اور صاحبان غور و فکر طمانچے مار مار کر مُنہ لال کر دیں گے۔

باقی ائمہ اہلبیتؑ کا دورِ زندگی

ایک حقائق سے بے خبر اور تعصب سے اندھا آدمی کہہ سکتا ہے کہ آپ کے ائمہ نے جن پر آپ کے عقیدہ کے مطابق مذہب کی پوری ذمہ داری تھی اسلام کی کیا خاص خدمت انجام دی۔ ان سے ہزار درجہ بہتر خدمت تو علمائے اسلام نے کی ہے انہوں نے قرآن کی تفسیریں لکھیں۔ احادیث کی کتابیں مدوّن کیں تاریخیں

تصنیف کیں۔ فقہ کے مسائل جمع کیئے آپ کے ائمہ نے بتایئے ان میں سے کیا کیا کام کیئے۔ اگر بالفرض ان کے چند خطبے ہوئے بھی تو کیا ان سے حق ہدایت انجام پا گیا یہ کام بھی صرف حضرت علیؑ تک محدود رہا۔ آگے صفر۔ رہی عملی جدوجہد اس کا سلسلہ امام حسینؑ پر جا کر ختم ہو گیا ان کے بعد آپ کا ہر امام گمنامی کے گوشہ میں پڑا اللہ اللہ کرتا رہا۔ کیا بس اتنے ہی کام کے لیئے رسولؐ نے ان کو قرآن کے ساتھ کیا تھا۔

اس کا جواب ایک طولانی درد بھری کہانی ہے جس کو مجبور ہو کر ہمیں بیان کرنا پڑ رہا ہے۔

اہلبیت رسولؐ کے اقتدار پر حملے

رسولؐ کی زندگی میں اہلبیت علیہم السلام کو ایسا اقتدار اعلیٰ بلحاظ اپنے نفسانی اور روحانی فضائل کے حاصل رہا تھا کہ ہر مسلمان کی جبین عقیدت ان کی بارگاہ فضل وکمال میں جھکتی تھی اور ہر شخص ان کی فضیلت کا معترف نظر آتا تھا۔ اگرچہ دلوں میں کینہ توزی کا دھواں امنڈ رہا تھا مگر زبان سے ان کے خلاف ایک لفظ نکالتے تھے تھی کیونکہ وحی کی ڈانٹ کا توی خطرہ تھا۔

آنحضرت کے مرتے ہی اس اقتدار پر رفتہ رفتہ کاری ضربیں پڑنی شروع ہو گئیں تا اینکہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ یہ اقتدار سسک سسک کر دم توڑ بیٹھا۔ اب یہ تلخ داستان بھی سن لیجیئے کہ اس نورانی ہیکل پر کیا کیا کاری ضربیں لگائی گئیں۔

---

(۱) مالی قوت اقتدار کے چہرہ کی چمک ہے بالخصوص جب مال و دولت پر

ہمدردی و سخاوت کا سایہ ہو تو جوق جوق لوگ کھینچ کر آتے اور اپنی اپنی حاجت صاحب مال سے بیان کرتے ہیں۔ حضرت علی کے پاس کوئی خزانہ عامرہ تو تھا نہیں لے دے کے چند باغ تھے جن کی آمدنی سے وہ غریبوں کی حاجت روائی کرتے تھے اور راہ خدا میں اتنا دیتے تھے کہ اس کی شہرت سن سن کر دور دور سے لوگ مدینہ رسولؐ میں آتے اور دامن مراد بھر کر جاتے تھے۔ یہ رجوع بد بین نگاہوں میں خار کی طرح کھٹک رہی تھی لہذا سب سے پہلے اسی پر حملہ کیا گیا اور جس طرح بنا ان کی مالی حالت کو کمزور بنانے کی کوشش کی گئی۔ یہ سلسلہ حضرت علی کے زمانہ سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام کے دور تک مسلسل چلا گیا۔ ائمہ اہلبیت کو حکومتوں نے کبھی کوئی وظیفہ نہیں دیا خمس جو ان کا خدا اور رسول کی طرف سے مقرر کیا ہوا حق تھا اس کو بند کر دیا انتہا یہ ہے کہ ان کے پیرو اور اہلبیت کے حق شناس جو رقم خمس اپنے امام کی خدمت میں پہونچانا چاہتے ان پر بھی پابندی عاید کر دی۔ دروازوں پر پہرے بٹھا دئیے جاسوس لگے ہوئے تھے کہ کوئی رقم کسی امام کی خدمت میں پیش کرنے تو نہیں جا رہا اگر پتہ لگ جاتا تھا تو حق اہلبیت ادا کرنے والے کو سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ جب اس طرح آمد کا دروازہ بند ہو گیا تو اب وہ کسی کی حاجت کو رفع کرنے کی قابل رہ کیسے سکتے تھے۔ نتیجہ میں لوگوں کی آمد و رفت خود بخود کم ہو گئی۔

---

(۲) دوسرا امر جو ان کے روحانی اقتدار میں زور پیدا کر رہا تھا وہ رسولؐ کی حدیث کے مطابق ان کا قرآن کے ساتھ ہونا تھا۔ لہذا اس کا بندوبست پہلے ہی سے کر دیا گیا حیات رسولؐ ہی میں یہ آواز گونج گئی تھی کہ ہمارے لئے کتاب خدا کافی ہے۔ اہلبیت کی

ضرورت ہی نہیں۔ اس کے بعد دوسرا ردِعمل یہ ہوا کہ امیرالمومنین علیہ السلام نے موافق تنزیل جو قرآن جمع کیا تھا حکومت نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو رد کر دیا اور کچھ دنوں بعد جو قرآن جمع کیا گیا اس میں بہت سے غور و تامل کے بعد ایسی ترتیب رکھی گئی کہ اہلبیت کی شان میں جو آیات تھیں وہ اپنے اپنے مقامات سے ہٹ کر کہیں سے کہیں پہونچ گئیں اور ان کا سیاق و سباق ایسا بدلا کہ اس امر کا پتہ چلانا دشوار ہو گیا کہ کون آیت ان کی شان میں ہے۔

تیسرا حملہ یہ ہوا کہ ان کی تفسیر قابل قبول نہ رہی بلکہ اس کے مقابل اور بہت سی تفسیریں وضع ہو گئیں۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی کہ ائمہ اہلبیت کا کوئی تعلق قرآن سے ہے بھی۔ ایسی صورت میں کون ان کو اپنا روحانی اور ایمانی پیشوا ماننے کے لئے تیار ہوتا۔ خاص کر جبکہ تمام حکومتیں اپنی کوششوں کا پسینہ اس پر ٹپکا رہی ہوں کہ تفسیر اہلبیت کو کان دہر کر سنا ہی نہ جائے چنانچہ بنی امیہ اور بنی عباس کے دور میں جو تفسیریں لکھی گئیں ان میں ہمارے ائمہ کی تفسیر اول تو بیان ہی نہیں ہوی اور اگر کہیں بھولے سے کوئی قول درج کر دیا گیا ہے تو کسی دوسرے مفسر کے قول سے ساتھ ہی ساتھ اس کی تردید بھی کر دی گئی۔

غرض مسلمانوں نے قرآن و تفسیر دونوں سے اہلبیت کا تعلق قطع کر دیا اور نئے نئے ایسے مفسر بنا کر جنہیں بہت کم رسولؐ سے کسی آیت کی تفسیر سننے کا اتفاق ہوا تھا فن تفسیر کا حق ادا کر دیا گیا۔

---

(۳) ایک اور چیز جو ائمہ اہلبیت کی طرف رجوع کا سبب بن سکتی تھی۔ حدیث کا علم تھا۔ کیونکہ رسول سے سب سے زیادہ احادیث کے سننے والے حضرت علی علیہ السلام تھے بہ سبب اس کے کہ جلوت وخلوت میں ہمیشہ رسولؐ کے ساتھ رہتے تھے اور جو بات یہ پوچھتے تھے رسولؐ اس کو بتلاتے تھے اور جب یہ چپ ہوتے تھے تو رسولؐ خود تعلیم کی ابتدا کرتے تھے۔ لہذا یہ چیز ان کی مرجعیت کا سبب بن سکتی تھی۔ اس سلسلہ کی قطع وبرید اس طرح کی گئی کہ کتب احادیث کے مدّون کرنے والوں نے ان سے حدیث کی روایت کو ہی ختم کر دیا۔ کتب صحاح ستہ پر ایک نظر ڈالنے سے اس کا پتہ آپ کو چل جائے گا اور آپ کو یہ کیسی عجیب بات معلوم ہوگی کہ ان صحاح ستہ میں صرف حضرت ابوہریرہ سے جن کو دو سال سے زیادہ رسولؐ کی صحبت سے شرفیاب ہونے کا موقع نہیں ملا تھا اور اگر کچھ ملا بھی تو گاہے گاہے احادیث سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ ماشاء اللہ پانچ ہزار سے زیادہ احادیث منقول ہیں اور حضرت علیؑ سے تقریباً دو سو حضرت فاطمہ سے صرف ۱۹۔ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک بھی نہیں۔ اس کے علاوہ زیادہ راوی وہ لئے گئے جو پکے دشمن اہلبیت اور قاتلان آل رسولؐ تھے۔ جیسے عمر سعد، سنان بن انس۔ شمر ذی الجوشن وغیرہ۔

یہ سب اس لئے کیا گیا تاکہ کسی وقت بھی مسلمان فن حدیث میں ان کی طرف رجوع نہ کریں اور یہ سمجھنے پر مجبور رہوں کہ اگر یہ حضرات ثقہ ہوتے یا علم حدیث سے کوئی تعلق رکھتے ہوتے تو صحاح ستہ میں ان سے بھی احادیث مروی ہوتیں۔ کس قدر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ائمہ اہلبیت کی زبان سے کوئی حدیث رسولؐ سننے کو لوگ اس قدر ترس گئے تھے کہ جب امام رضا علیہ السلام

کی سواری مرو جاتے ہوئے خراسان میں پہونچی تو لوگوں نے روور کر عرض کی یا ابن رسول اللہ کم از کم ایک حدیث تو زبان مبارک سے ارشاد فرما دیجئے ہم معصوم کی زبان سے حدیث سننے کو ترس رہے ہیں۔ جب امام نے ان کی خواہش کے مطابق ایک حدیث بیان کی تو اس کے لکھنے کے لئے بیس ہزار قلمدان کھل گئے

اس سلسلہ میں یہ افسوس ناک حقیقت بھی سن لیجئے کہ لوگوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ آنحضرت نے بہ کثرت احادیث اپنے اہلبیت کی تعریف میں بیان فرما دی ہیں اور اس سے اندیشہ ہے کہ لوگ ان کو اپنا روحانی پیشوا مان لیں اور ان کے اقتدار کا نقش مسلمانوں کے دل پر جمتا چلا جائے حدیث سازی کا ایک نیا محکمہ کھول دیا گیا اور اس مصرف خاص کے لئے خزانوں کے منہ بھی کھل گئے بے دریغ دولت لٹنی شروع ہو گئی ایک کیا ہزاروں حدیثیں ان کی مذمت میں اور ان کے دشمنوں کے فضائل میں تصنیف ہونی شروع ہو گئیں جو آج تک معاویہ شاہی ٹکسال کے سکے کہلاتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں ہوا بلکہ ان موضوعہ احادیث کو منبروں پر بیان کیا گیا۔ مکاتب و مدارس میں ان کا باقاعدہ درس شروع ہوا کتنی احادیث وضع ہوئیں اس سیلاب کا اندازہ کرنا عقل بشری سے خارج ہے۔ صرف تھوڑا سا قیاس اس سے کر لیجئے کہ امام بخاری نے اپنی صحیح لکھتے وقت سترہ ہزار موضوعہ احادیث کو قلم زد کیا۔ بخاری کے بعد پانچ صحاح اور رہیں ان کے مدون کرنے والوں نے بھی یہ ٹکسال باہر سکے ضرور نکال پھینکے ہوں گے کون بتا سکتا ہے کہ ان کی تعداد کیا تھی۔

باوجودیکہ لاکھوں کی تعداد میں یہ مصنوعی حدیثیں نکال پھینکی گئیں پھر بھی

ہزاروں کی تعداد میں اب بھی ایسی موجود ہیں جن سے رنگیلا رسولؐ جیسی کتاب لکھی جا سکتی ہے جن سے مذہب شیعہ کی جڑ پر آرہ چلایا گیا ہے جن سے منقصب اہلبیت کے پہلو نکلتے ہیں جن سے ایسے لوگوں کے فضائل کا اثبات ہوتا ہے۔ جن کی بار بار رسولؐ نے مذمت کی تھی اور جن کے کردار پر بے شمار بدنما داغ تھے جن کا ایمان کوڑیوں کے مول بک گیا تھا۔

اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار ائمہ حدیث اسلام کی سطح پر نظر آنے لگے جن کے شور و غل میں ائمہ اہلبیت کی آوازیں دب گئیں اور ان کی بیان کردہ احادیث اس قابل ہی نہ رہیں کہ ان کو سچ سمجھا جائے بلکہ ان کو اتنا موقع ہی نہ دیا گیا کہ وہ اپنی سند سے احادیث سنانے۔ کیونکہ یہ اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی سزا میں ان کو قتل تک کیا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ احادیث کی کیا خدمت انجام دیتے پھر بھی انہوں نے اپنے اس فرض سے غفلت نہیں کی جس کا بیان آگے آئے گا۔

یہ تھی وہ ناپاک کوشش جس نے ائمہ اہلبیت کو حدیث سے جدا کر دیا اور ان کا روحانی اقتدار تپ دق میں مبتلا ہو گیا۔

---

(۱) یہ تو آپ نے سن لیا کہ قرآن و تفسیر و حدیث سے کس خوبی کے ساتھ اہلبیت کا تعلق قطع کر دیا گیا اب فقہ کا حال بھی سن لیجیے۔ چونکہ اصلی فقہ کے جاننے والے ائمہ اہلبیت تھے لہذا حکومتوں کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں اس فن میں لوگ ان کو امام نہ مان لیں۔ اس کی روک تھام کرنا بھی ضروری تھا۔

دماغ لڑانے سے یہ مشکل بھی حل ہو گئی۔ اس فن کے بھی بہت سے امام بنا ڈالے گئے جن میں چار تو خاص الخاص ہی ہیں۔ چاہے ایک فقہ اسلامی کے چار ٹکڑے ہو گئے چاہے قیاسات کی زد میں فقہی مسائل غرقاب ہو کر رہ گئے مگر ائمہ اہلبیت کا تعلق فقہ سے باقی نہ رہا۔

---

(۵) علم کلام میں بھی ائمہ اہلبیت کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ الٰہیات کے بڑے بڑے دقیق مسائل انھوں نے حل کئے تھے۔ لہٰذا یہ چیز بھی ذریعہ رجوع بن سکتی تھی اور مسلمانوں میں ان کی یہ خدمات خراج تحسین حاصل کر سکتی تھیں۔ لہٰذا اس علم کے امام بھی جداگانہ کر دئے گئے جنھوں نے ماشاء اللہ وہ وہ طبع آزمائیاں فرمائیں اور ایسے عجیب و غریب نکتے پیدا کئے کہ اسلام کی مایۂ ناز توحید ہزار بھولوں سے سج گئی۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہوا اہلبیت سے اس معاملہ میں بھی رجوع کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

امیر المومنینؑ کے وہ عظیم الشان اور ایمان افروز خطبے جو نہج البلاغہ میں موجود ہیں اس قابل بھی نہ سمجھے گئے کہ خطبا منبروں پر بیان کریں یا نصاب تعلیم میں ان کو بھی کہیں جگہ دی جائے۔

آپ نے دیکھا وہ دین اسلام جو رسولؐ کے گھر سے نکلا تھا جس کے جملہ علوم کے عالم حضرت علیؑ اور دیگر ائمہ تھے جو من عندہٗ علم الکتاب کے مصداق تھے جو بمصداق آیت تطہیر معصوم بھی تھے۔ جو ہر قسم کے رجس سے پاک بھی تھے جو شہر علم نبوی کا دروازہ بھی تھے جو دار حکمت کا باب بھی تھے کس طرح ان کو

اسلامی ذمہ داریوں سے ہٹا دیا گیا۔ کس طرح ان کو دینی علوم سے بے تعلق کر دیا گیا گویا اس دین سے ان کو کوئی لگاؤ ہی نہیں۔ یہ کسی اور قوم کی فرد ہیں۔

یہ سب کچھ ہوا سیاسی مصالح کی بنا پر لیکن بعد کو بغض اہلبیت مذہب کا جزو بن گیا اور ان سے بے تعلقی شعار اسلام قرار پا گئی۔

---

(۶) رہی تاریخ اس نے بھی بنی امیہ اور بنی عباس کی نمک خواری کا پورا پورا حق ادا کر دیا کچھ مورخوں نے اس ڈر میں کہ بال میں بندھی تلوار ان کے سروں پر لٹک رہی تھی۔ کچھ نے مال و دولت کے لالچ میں۔ کچھ نے تعصب و عناد کی بنا پر ایسے ایسے واقعات ایجاد کئے کہ اہلبیت رسولؐ عوام الناس کے زمرہ سے بھی نیچے جا پڑے اور پست اخلاقی اور ذمامتِ نفس میں اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن گئے۔ سن لیجئے ان کے حالات میں تاریخ کس طرح مدوّن ہوئی اور کیا کیا شوشے چھوڑے گئے۔

(۱) کسی مورخ نے ان کے صحیح حالات درج کرنے کی کوشش نہ کی۔ اسی لئے اس خاندان کے نام تک محفوظ نہ رہے ان کے حالات تو کیا تفصیل سے لکھے جاتے۔

(۲) ان کے نام بدل کر کچھ سے کچھ کر دئے جس میں ایک بہت بڑی سیاسی غرض شامل تھی۔

(۳) ان کے قدیم خاندانی دشمنوں سے ان کے سببی رشتے قائم کر دئے۔

(۴) ابوطالبؑ کا کفر کی موت مرنا لکھ مارا۔

(۵) حضرت خدیجہ کو بجائے باکرہ کے بیوہ تحریر کر دیا۔

(۶) حضرت رسولخداؐ کی اولاد میں حضرت فاطمہ کے علاوہ تین لڑکیاں اور

پیدا کرلیں

(۷) حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہ کی زندگی میں ابوجہل کی لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش کی۔

(۸) حضرت علی کی بیٹی ام کلثوم کا عقد حضرت عمر سے بیان فرمادیا۔

(۹) حضرت علی علیہ السلام سیاست اسلامی سے واقف نہ تھے۔

(۱۰) حضرت علی نے خلفائے ثلثہ کی بیعت کرلی تھی اور ان حضرات سے ان کے تعلقات بہت دوستانہ اور مخلصانہ تھے۔

(۱۱) حضرت زینب کے انتقال کے بعد حضرت عبداللہ نے ان کی بہن ام کلثوم سے عقد کرلیا۔

(۱۲) حضرت امام حسن نے تین سو شادیاں کیں۔ وہ بڑے طلاق تھے ہر رات کو ایک نئی بی بی گھر میں لاتے تھے۔

(۱۳) امام حسن نے معاویہ کی بیعت کرلی تھی اور ان کے تعلقات معاویہ سے بہت اچھے تھے۔

(۱۴) خاندان رسالت معاویہ کا وظیفہ خوار تھا۔

(۱۵) امام حسینؑ اور یزید کے درمیان ایک حسین عورت ارنیب بنت اسحاق پر جھگڑا تھا کوئی دینی لڑائی نہ تھی۔

(۱۶) حضرت عقیل حضرت علی سے ناخوش ہو کر معاویہ سے جاملے تھے۔

(۱۷) حضرت محمد حنفیہ اور امام زین العابدین سے امامت پر جھگڑا ہوا۔

(۱۸) حضرت شہر بانو حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں کنیز بن کر آئیں اور حضرت

عمر نے ان کو امام حسین کو بخش دیا۔

(۱۹) حسین علیہ السلام معاذ اللہ باغی تھے انھوں نے یزید سے سلطنت چھیننی چاہی نتیجہ میں قتل ہوئے۔

(۲۰) قتل حسین میں یزید کا ہاتھ نہ تھا بلکہ ابن زیاد نے کیا جو کچھ کیا۔

(۲۱) امام حسین اپنے نانا کی تلوار سے قتل کئے گئے۔

(۲۲) سکینہ بنت الحسین عرب کی نامور شاعرہ اور مغنیہ تھیں انھوں نے پے درپے پانچ عقد کئے۔

(۲۳) قاتلان حسینؑ شیعہ تھے۔

یہ چند موٹی موٹی باتیں ہم نے تاریخ اسلام سے اخذ کر کے لکھدی ہیں یہ سب روایات محض اس لئے بنی تھیں کہ دنیائے اسلام کی نظر سے اہلبیت رسولؐ کی وقعت گر جائے اور ان کا کردار بدنام ہو۔ جس کے نتیجہ میں لوگوں کی رجوع ان کی طرف نہ رہے۔

---

(۷) ایک چیز اور کھٹک کی تھی وہ ائمہ اہلبیت کا زہد۔ فقر پسندی اور تزکیہ نفس تھا۔ یہ بھی ان کی مرجعیت کا ایک سبب قوی بن رہا تھا لوگ کھنچ کھنچ کر ان کی طرف آرہے تھے۔ لہذا اس رخنہ کا منہ بند کرنا بھی ضروری تھا اس کے لئے ان کے مقابل صوفیائے کرام کا ایک گروہ بنایا گیا۔ اور ان کے کشف و کرامت اور خارق عادات امور کو خوب اچھالا گیا ان کو ولی اللہ۔ قطب۔ ابدال۔ شیخ طریقت فنا فی اللہ۔ مجذوب۔ شاہ۔ پیر۔ دست گیر وغیرہ کے معزز القاب عطا کئے گئے۔ بینکڑوں

معجزات ان سے منسوب کئے گئے۔ اور ایک ولی کی بجائے ہزار ولی بنا دیئے گئے۔ اور ولی بھی ایسے کہ جب چاہتے تھے خدا سے ملاقات کرا تے تھے اس کو اپنے اندر سموئے ہوئے چلے آتے تھے۔ موقع پا کر اس سے جھگڑا بھی کر بیٹھتے تھے۔ یہ سب کھیل اس لئے کھیلا گیا کہ ائمہ اہلبیت کی طرف سے لوگوں کی طبیعت ہٹ جائے اور ان کے کشف و کرامت کے لوگ معتقد نہ رہیں۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہل عقل و انصاف بتائیں کہ ائمہ اہلبیت اپنے فرائض کو کیسے انجام دیتے اور کہاں انجام دیتے۔

بیکسی و بے بسی میں ائمہ اہلبیتؑ کی خدمات

کسی گم گشتہ راہ قوم پر ہدایت کا دروازہ کھولنے کے لئے ایک ہادی کے لئے چند باتوں کی ضرورت ہے۔

(۱) حکومت اس کی تعلیم کے مخالف نہ ہو

(۲) امن و اماں کی زندگی بسر کرنے کا اسے موقع ملے۔

(۳) اطمینان خاطر نصیب ہو۔

(۴) حق بات کو آزادی سے بیان کر سکے

(۵) پبلک اس کی تقریر کو کان لگا کر سنے۔

ہمارے ائمہ کو ان پانچوں باتوں میں ایک بات بھی نصیب نہ تھی حکومتوں کے جبر و تشدد نے ان پر دائرہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ ان کا وجود سلاطین کی نظر

میں خار کی طرح کھٹکتا تھا۔ ان کے قتل کا بہانہ ڈھونڈا جاتا تھا۔ ان کے پیرو چن چن کر قتل کیے جاتے تھے۔ قید و بند کی تکلیفیں جھیلتے تھے۔ جلسہ عام میں ان کو تقریر کرنے کی اجازت نہ تھی۔ حکومت کے کسی رویہ پر لب کشائی کی مجال نہ تھی۔ شیعی عقائد کی نشر و اشاعت پر کڑی نگرانی تھی۔ تمدنی و معاشرتی مراعات ان سے سلب کر لی گئی تھیں۔ ان کو حکومت کا کھلا ہوا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ ان کے کسی قول کو نقل کرنا جرم تھا ان کے کسی فعل کو نمونہ عمل بنانا سخت گناہ تھا۔

یہ تھا وہ ماحول جس میں ہمارے ائمہ اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔ غور کیجئے ایسی فضا میں جہاں ظلم و جور کی بجلیاں ہر طرف چمک رہی ہوں وہ اپنے فرائض امامت کو کس طرح پورا کر سکتے تھے۔ چاہتے سب کچھ تھے مگر وقت کی نامساعدت اور قوم کی عداوت کچھ کرنے ہی نہ دیتی تھی۔

یہ نہ سمجھنا کہ ایسے روح فرسا اور ہمت شکن دور میں وہ اپنے فرض سے غافل رہے ہرگز نہیں وقت نے جتنی اجازت دی اُسے پورا کئے بغیر نہ رہے گمراہی کے طلسم توڑنے میں اپنی جان کی بازی لگا دی۔ قید خانوں میں جا کر بھی ہدایت کا دروازہ بند نہ کیا۔ اب مختصر سا حال ان کی اسلامی خدمت کا سن لیجئے۔

امام زین العابدین علیہ السلام کا زمانہ

امام حسین علیہ السلام کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کی امامت کا زمانہ آیا۔ جس کا ابتدائی حصہ زندان کوفہ و شام میں گزرا۔ مدینہ واپس آئے

تو شب و روز واقعہ کربلا کی یاد میں روتے رہے۔ گھر کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اس پر بھی حکومت کو ان کی طرف سے خطرہ تھا کہ اگر کسی جلسہ میں انھوں نے درد بھری داستان دہرا دی تو دنیا کے دل میں ہل چل مچ جائے گی۔ لہذا ان کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ واقعہ کربلا کسی منظر عام پر بیان کر سکیں۔

اس دور میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ تو زبان سے کہتے تھے مگر ان کا ایمان نہ اللہ پر تھا نہ رسولؐ پر۔ ملحدوں زندیقوں اور کفر پرستوں کے عقائد ان کے دل و دماغ پر اپنا شیشہ جادو مار چکے تھے دین الٰہی کی یہ تباہی امام کے دل کو نشتر غم سے برما رہی تھی۔ لہذا عقائد حقہ کی تعلیم کا ایک ایسا عجیب و غریب طریقہ ایجاد کیا جس کی تعریف ایک مصری عالم نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"جس زمانہ میں میں امام زین العابدین کی صحیفہ کاملہ کا مطالعہ کر رہا تھا اس وقت مجھے حضرتؑ کے روحانی کمالات کی قدر ہوئی۔ حضرت نے اپنی مناجاتوں میں الہیات۔ انسانی تاثرات۔ دشمنان دین کے توحید و نبوت و قیامت وغیرہ پر اعتراضات اور ان کے جوابات۔ نفس انسانی کی کمزوری۔ مسلمانوں کے عقاید کی کمزوری۔ بندگی کے فرائض۔ تزکیہ نفس کے درجات اس خوبی سے بیان فرمائے ہیں کہ ان

کی داد نہیں دی جا سکتی۔ بظاہر وہ حضرت کی دعائیں ہیں مناجاتیں ہیں۔ خضوع و خشوع کی نورانی تصویریں لیکن ان پردوں کے اندر اسلامی فلسفہ کے وہ دقیق مسائل حل کیے گئے ہیں جن کی تہ تک پہونچنے والا یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ الہامی اور وہبی چیزیں ہیں۔

میری جان اس پیرایہ بیان پر قربان ہو کہ ایسے تشدد آگیں دور میں جبکہ آپ کو زبان کھولنے کا یارا نہ تھا جب کہ ایک ایک لفظ کی گرفت ہوتی تھی آپ نے ایسے عنوان سے ہدایت کی کہ نہ حکومتیں گرفت کر سکیں نہ ان کے مخالف روک سکے۔

اس صحیفہ شریفہ کا اسلامی دنیا میں رواج نہ پانا اور مسلمانوں کا اس کو سر و آنکھوں پر نہ رکھنا اس کا ثبوت ہے کہ ان مناجاتوں میں ان کے غلط عقاید کی گردنیں توڑ دی گئی ہیں۔ اور ان کے اعمال کو ہباءً منثورا قرار دیدیا گیا ہے۔"

اس عظیم الشان اسلامی خدمت کی داد کون دے سکتا ہے اس مختصر رسالہ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم زبور آل محمدؐ کے جملوں کی تشریح کر سکیں ورنہ دکھاتے کہ مذاہب باطلہ کا ابطال کس بلیغ پیرایہ میں کیا گیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کا زمانہ

اگر جفا پیشہ سلاطین کی تیوریوں پر تعصب کے بل نہ ہوتے تو امام محمد باقر علیہ السلام کے علمی سر چشمے صرف عطار بن جریج۔ ابو حنیفہ۔ امام زہری اور امام اوزاعی جیسے جلیل القدر علمائے اہلسنت تک محدود نہ رہتے بلکہ دنیا کا ایک بڑا حصہ ان سے فیضیاب نظر آتا مگر ناسا عد زمانہ نے ان کی تعلیم و ہدایت کے دائرہ کو وسیع نہ ہونے دیا۔ ایک طرف سلاطین کی کڑی نگرانی دوسری طرف علماء سوء کی مخالفت پھر حاسدوں کا بغض للّٰہی ایسی سخت رکاوٹیں تھیں جنہوں نے فلسفہ آل محمدؐ کو عالم سے روشناس نہ ہونے دیا۔ پھر بھی انہوں نے اپنی احادیث میں اسلام کے وہ حقائق و معارف بیان کیے جو آج تک عرفان و تقین کی آنکھوں کا نور ہیں۔

جب یہودیوں اور نصرانیوں سے مسلمان علمائے مناظرے ہوتے تھے اور مسلمان بغلیں جھانکتے نظر آتے تھے تو اس وقت اسی منصوص من اللہ امام سے مدد چاہی جاتی تھی اس وقت نہ ابو حنیفہ یاد آتے تھے نہ امام اوزاعی۔

احتجاج طبرسی میں آپ کے ایسے مناظرے موجود ہیں۔ جن سے آپ نے بہت سے دشمنان اسلام کو دائرہ اسلام میں داخل کیا اور مسلمانوں کے غلط عقاید کی اصلاح کی۔ کیا یہ معمولی خدمت تھی۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام کا زمانہ

اس دور میں بنی امیہ کا نظام سلطنت اپنی سابق سطح سے اتنا نیچے اتر آیا تھا کہ اسلامی تعلیمات کو اس کے کسی گوشہ میں پیر پھیلانے کا موقع ہی نہ تھا ایسے پر آشوب دور میں امام علیہ السلام مسجد نبوی میں برابر درس دیتے رہے اور لوگوں کو حقائق اسلام سمجھاتے رہے۔ حضرت کے درس میں شرکت کرنے والے کم سے کم چار سو اہل علم تھے جنھوں نے آپ سے سنکر احادیث صحیح کو جمع کیا۔ جن کتابوں میں یہ احادیث جمع ہوئیں ان کی تعداد چار سو تھی جناب زید کی شہادت، عباسی حکومت کا آغاز، منصور کے ہاتھوں حسنی سادات کی تباہی۔ امام علیہ السلام سے منصور کی بدسلوکیاں ایسے زبردست مواقع تھے کہ امام علیہ السلام کو اپنے روحانی کمالات دکھانے اور علوم الٰہیہ کی روشنی پھیلانے کا پورا موقع نہ ملا۔ تاہم بے شمار علمی گتھیوں کو سلجھایا اور وہ سربستہ راز کھولے جن تک اسلام کے بڑے بڑے علمار کی نظر نہ تھی۔ حدیث ہلیلہ۔ حدیث مفضل۔ ہشام بن الحکم کے مناظرے اور مکالمے وغیرہ انہی اسرار و غوائص کے خزانے ہیں۔ اگر حکمران قوتیں پشتی پر ہوتیں اور زمانہ آل محمد کے موافق ہوتا تو دنیا دیکھتی کہ ان کے سینوں سے نکل کر علم و حکمت کے سمندر کس طرح بہتے اور روحانیت کے حیرت انگیز اثرات کہاں سے کہاں پہنچتے

امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کا زمانہ

امام علیہ السلام کو سلاطین بنی عباس کے ہاتھوں وہ روح فرسا مظالم برداشت

کرنا پڑے جن سے کلیجہ لرزتا ہے۔ مہدی۔ ہادی اور ہارون کی سخت گیری اور جابرانہ رویہ نے ایک دن حضرت کو چین سے نہ رہنے دیا جس مظلوم نے پندرہ سال سے زاید مدت قید خانوں میں گزاری ہو جس کے پاس کسی محب اہلبیت کے جانے کی اجازت نہ ہو فرمایئے وہ عقاید حقہ کی ترویج کس طرح کرتے جو کچھ احادیث ان کی ہم تک پہنچی ہیں وہ اعجاز ہی اعجاز ہے۔

امام رضا علیہ السّلام کا زمانہ

آپ کا زمانہ بھی انتہائی پریشانی میں گزرا ایک داخلی پریشانی تو یہ تھی کہ بعض افراد خاندانی مخالفت پر کمربستہ تھے اور اس میں بڑا ہاتھ حکمران قوتوں کی سازش کا تھا۔ دوسرے عباسیوں کی مخالفت۔ مامون کی سیاسی چالیں۔ اگرچہ اس نے سیاسی مصالح کی بنا پر امام علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنا لیا تھا۔ مگر دل میں جو عداوت بیٹھی ہوئی تھی وہ کہاں جاتی آخر وہ زہر بن کر انگوروں میں سما ہی گئی اور امام کی ہلاکت کا باعث بن کر رہی۔ آپ کی ولی عہدی کے چند سال ضرور ایسے تھے کہ علوم ربانی اور احکام الٰہی کے متعلق بے شمار حقائق بیان کر سکتے تھے لیکن عباسیوں کی مخالفت نے نشر و اشاعت کا موقعہ ہی نہ دیا۔ تاہم عیون اخبار الرضا وغیرہ میں جو احادیث ان کی جمع ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے مذہب حقہ کی کیا گرانقدر خدمت انجام دی ہے۔

امام محمد تقی علیہ السلام کا زمانہ

مامون کی پولٹیکل چالیں۔ عباسیوں کی شدید مخالفت ام الفضل دختر مامون کا آپ کے عقد میں آنے کے بعد آپ کا مخالف بن جانا۔ عباسیوں کا اس کو بھڑکا کر امام کی پریشانیوں میں اضافہ کرنا۔ مامون کے بعد معتصم کی سخت گیری وحشیانہ مخالفت یہ سب مواقع کچھ اس طرح جمع ہوئے تھے کہ امام محمد تقی علیہ السلام جیسا چاہتے تھے لوگوں کو علم دین کی تعلیم نہ دے سکے۔ مسجد نبوی میں طالبان علم کا ایک جم غفیر آپ کے سامنے رہتا تھا آپ ان کو قرآن و حدیث کا درس دیتے تھے مخالفوں کو یہ سخت ناگوار ہوا انہوں نے حکمرانوں کو بھڑکایا اور اس مجمع کو منتشر کرنے کی کوشش کی گئی۔

امام علی نقی علیہ السلام کا زمانہ

متوکل عباسی کی جو سادات کُش پالیسی تھی اس کو کون نہیں جانتا۔ ہر سید کا وجود۔ ہر محب اہلبیت کا وجود اس کی نظر میں خار تھا اس نے امام علی نقی علیہ السلام کو دھوکہ کے ساتھ مدینہ سے سامرہ بلایا اور نظر بند کر دیا اور پھر وہ ظلم کیے کہ خدا کی پناہ۔ کئی بار قتل کا ارادہ کیا مگر بقدرت خدا ناکامی ہوئی۔ ایسی صورت میں بھی اس عالم ربّانی نے جتنا ہو سکتا تھا کیا۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کا زمانہ

معتمد، مہتدی اور معتمد وغیرہ عباسی سلاطین کے عہد خلافت میں کون سی ایذا تھی جو نہ پہونچائی گئی۔ اقتصادی ماردی گئی گھر پر پہرہ بٹھایا گیا۔ خانہ تلاشی ہوئی درندوں کے سامنے چھوڑا گیا۔ قیدخانہ میں بند کیا گیا۔ ٹھنڈے پانی اور تازہ غذا کی ممانعت ہوئی۔ ان سخت حالتوں میں بھی امام علیہ السلام ترویج مذہب حقہ میں سعی فرماتے رہے اور قرآن کی تفسیر اور احادیث کی توضیح جتنا موقع ملا کرتے رہے چنانچہ آپ کی ایک تفسیر جو تفسیر اہلبیت کہلاتی ہے اس کی شاہد ہے یہ تفسیر چھپ چکی ہے۔ اس کا مختصر ہونا بتاتا ہے کہ حضرت کو اس سے زیادہ موقع نہیں ملا

آپ غور کریں ائمہ اہلبیت علیہم السلام کیسے جبر پسند اور تشدد آگیں دور میں اپنی زندگیاں بسر کریں۔ چونکہ زمانہ ان کے خلاف تھا لہذا ان سے جو احادیث لوگوں نے جمع کیں سلاطین وقت نے ان کتابوں کو تلف کرا دیا ان کتب خانوں کو جلوا دیا جن میں ایسی کتابیں موجود تھیں ایسی حالت میں جو خدمتیں انہوں نے کیں وہ بھی پوری طرح محفوظ نہ رہ سکیں۔ یہ تو اعجازی شان ہے کہ ایسی حالت کے بعد بھی ان کی ہزارہا احادیث ہم تک پہونچ گئی ہیں۔ اور ہماری کتب احادیث میں ایک ذخیرہ ان کی تعلیمات کا موجود ہے۔ کس قدر حق پوشی اور ناحق کوشی ہے یہ کہنا کہ انہوں نے کوئی خدمت انجام ہی نہیں دی۔

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ۔\
بازمے گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

چند جواب طلب سوالات

ہمارے ائمہ پر تو یہ اعتراضات کی بھرمار ہے لیکن ہمارے مخالف اپنے پیشوایان دین کے حالات پر نظر نہیں کرتے۔ اب ہم ان سے چند سوالات کرنیکا حق رکھتے ہیں۔ (۱) آپ کے خلفائے نے قرآن کی کتنی تفسیریں لکھیں۔

(۲) کتنی آیات کا مفہوم سمجھایا

(۳) کتنی کتابیں علم دین میں تصنیف کیں

(۴) اپنے خطبوں میں الہیات وغیرہ کے کتنے مسائل حل کئے۔

(۵) غیر مسلم ادیان کے علماء سے کتنے مناظرے کئے۔

(۶) فقہ میں ان کے کتنے اقوال مانے گئے۔

(۷) اخلاق میں ان کے عملی نمونے کیسے رہے۔

اگر ان سب کا جواب نفی میں ہے تو ایسا کیوں ہوا۔ ان کو زمانہ نے مہلت دی تھی۔ ان کو ہر لحاظ سے سکون و اطمینان نصیب تھا۔ آپ کے عقیدہ کی رو سے وہ دین الٰہی کے حافظ اور قرآن و حدیث کے عالم تھے۔ پھر انہوں نے ایسا کیوں نہ کیا۔ کیا ائمہ اہلبیت کی سی مجبوریاں ان کو بھی لاحق تھیں۔ چونکہ یہ کام ان کے بوتے کا نہ تھا۔ لہذا رسولؐ نے قرآن کا دامن ان کے دامن سے باندھا ہی نہیں۔ اگر آپ کے نزدیک تسخیر ممالک اسلام کی سب سے بڑی خدمت تھی تو خلیفہ رسولؐ کے فرائض میں اس کو ایک فریضہ ثابت کر دیجئے اگر کہیے کہ تسخیر ممالک کے بعد انہوں نے لاکھوں کروڑوں کو مسلمان بنایا تو یہ کس طرح اگر

بہ جبر بنایا تو لا اکراہ فی الدین کے خلاف تھا۔ اگر حقائق اسلام سمجھا کر بنایا تو کس فرقہ کی رو سے اسلام میں تو تہتر فرقے ہیں۔ جس فرقہ کی رو سے اسلام کی تعلیم دی دوسرا فرقہ کہے گا وہ تعلیم ہی چونکہ غلط تھی لہذا وہ حقیقی مسلمان ہی نہ بنے۔

اہلبیت نبوت کی خدمات اسلامی کا خلاصہ

(۱) انھوں نے شرارت پسندی اور فتنہ پروری کو روا نہیں رکھا۔

(۲) انہوں نے کسی وقت جارحانہ حملہ نہیں کیا۔

(۳) انہوں نے مال و دولت کو کبھی جمع نہیں کیا۔

(۴) اہل حاجت کی ضرورتوں پر اپنے ضروریات پر مقدم رکھا۔

(۵) انہوں نے دشمنوں سے بھی نیکی کی

(۶) کبھی مکرو فریب سے کسی کا حق نہیں مارا۔

(۷) انھوں نے کسی فرد واحد کو بھی ستایا نہیں

(۸) کسی حالت میں اخلاقی محاسن کو نظر انداز نہیں کیا۔

(۹) فقہی مسائل میں اپنی طرف سے کتر بیونت نہیں کیا

(۱۰) تفسیر احادیث اور مفاہیم احادیث بیان کرنے میں ان کے اقوال آپس میں ٹکرائے نہیں۔

(۱۱) انہوں نے دین کو دنیا پر ترجیح دی۔

(۱۲) انہوں نے مفاد اسلام کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے حقوق سے دست برداری کی

(۱۳) انھوں نے اپنے شب و روز عبادت الٰہی میں بسر کیئے۔

(۱۴) ان کے ایمان کی کمزوری کسی موقع پر ثابت نہ ہوی۔

(۱۵) نصرت دین میں انھوں نے جان و مال و آبرو کسی چیز کی پروا نہیں کی۔

(۱۶) انہوں نے اپنے ایمان کو کسی قیمت پر نہیں بیچا۔

(۱۷) اعمال صالحہ میں وہ سب سے آگے رہے

(۱۸) حق کو باطل سے انہوں نے کبھی بھول کر بھی نہیں ملایا

(۱۹) احادیث رسولؐ میں انہوں نے کتر بیونت نہیں کی۔ رسولؐ کی طرف سے کوی حدیث خود نہیں بنائی۔

(۲۰) قرآن کی کوی تاویل اپنی طرف سے نہیں کی۔

(۲۱) ہر قضیہ کا فیصلہ قرآن و حدیث سے کیا اپنی غرض کو اس میں شامل نہیں کیا

(۲۲) الٰہیات کے مسائل کو ایسا سمجھایا کہ دوسروں سے ممکن نہیں

(۲۳) خلقت انسانی کے راز کھولے۔ مخلوقات عالم میں خدا کی صنعت کاملہ کو بیان کیا

(۲۴) ایسا کردار پیش کیا کہ دشمنوں نے اس کی تعریف کی۔

(۲۵) قید و بند میں رہ کر بھی وہ ہدایت سے نہ چوکے

(۲۶) محتاجوں اور مسکینوں کو اتنا دیا کہ لوگ آج ان کا نام لے کر حاجت روای چاہتے ہیں۔

(۲۷) انھوں نے بجبر کسی کو مسلمان نہیں کیا بلکہ حقائق سمجھا کر

(۲۸) دشمنوں کو بھی صحیح مشورہ دینے سے گریز نہیں کیا۔

(۲۹) اپنے ظاہر کو باطن سے الگ نہیں بنایا۔

(۳۰) قرآن کا کوئی حکم بغیر عمل کے نہیں چھوڑا۔

(۳۱) کبھی بھولے سے کسی گناہ کی طرف قدم نہیں بڑھایا

(۳۲) انھوں نے اقتدار کی بھیک کسی سے نہیں مانگی

(۳۳) دشمن کی سطوت سے مرعوب ہو کر انھوں نے حق پوشی نہیں کی

(۳۴) خدا کی توحید اور آنحضرتؐ کی نبوت میں انہیں کبھی شک نہیں ہوا۔

(۳۵) انھوں نے کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال نہیں بنایا۔

(۳۶) انھوں نے مال و دولت پر کبھی رال نہیں ٹپکائی۔

(۳۷) زہد و فقر کو اپنا شعار بنایا۔

(۳۸) ان کا یقین اس حد تک تھا کہ اس میں زیادتی کا امکان نہ تھا۔

(۳۹) انھوں نے ہدایت خلق سے کبھی پہلو تہی نہیں کیا۔

(۴۰) انھوں نے اسلام کے صحیح عمل کا نمونہ ہر زمانہ میں پیش کیا۔

(۴۱) انھوں نے سلطنت کے زمانہ میں بھی شاہانہ تزک و احتشام نہ دکھایا

(۴۲) انھوں نے کبھی غرور و تکبر کو راہ نہ دی

(۴۳) دشمنوں کے مقابل عزیز رہے مسلمانوں کے مقابل نہایت متواضع

(۴۴) عبادت میں کبھی سستی و کاہلی نہ کی۔

(۴۵) صلہ رحم کو ترک نہ کیا

(۴۶) ہر مصیبت میں صبر و شکر سے کام کیا

(۴۷) خدا و رسولؐ کے کسی فعل پر لب شکایت وا نہ کیا۔

(۴۸) رضاً بقضائہ و تسلیماً لامرہ کے اصول پر قائم رہے۔

(۴۹) لذات دنیا کے شیدائی نہ بنے۔

(۵۰) کفر و شرک سے کبھی اُنس نہ رکھا۔

مذکورہ بالا تمام باتیں مسلمانوں کے لئے شمع راہ ثابت ہوئیں۔ اسلامی نظام حیات کے یہ بہترین نمونے تھے۔ انہوں نے تزکیہ نفس کے وہ بہترین سبق دئیے اور روحانی فضائل کو اتنا بلند کر کے دکھایا کہ ارباب سلوک و رشاد کے تمام سلسلے انہی پر جا کر ختم ہوتے ہیں اور ہر سلسلہ۔ قادریہ۔ چشتیہ۔ سہروردیہ وغیرہ اپنے کو حضرت علیؑ تک پہنچانا باعث صد افتخار جانتا ہے۔

افسوس ہے کہ ان کے سکھائے ہوئے سبق لوگوں نے بھلا دئے۔ ان کے نشان قدم پر چلنا گوارا نہ کیا۔ ورنہ مسلمانوں کی زندگی تمام اقوام عالم میں ایک نمونہ کی زندگی ہوتی۔ اور دینی اور دنیوی فلاح و بہبود کے دروازے ان پر کھل جاتے ۔:۔

تمت بالخیر

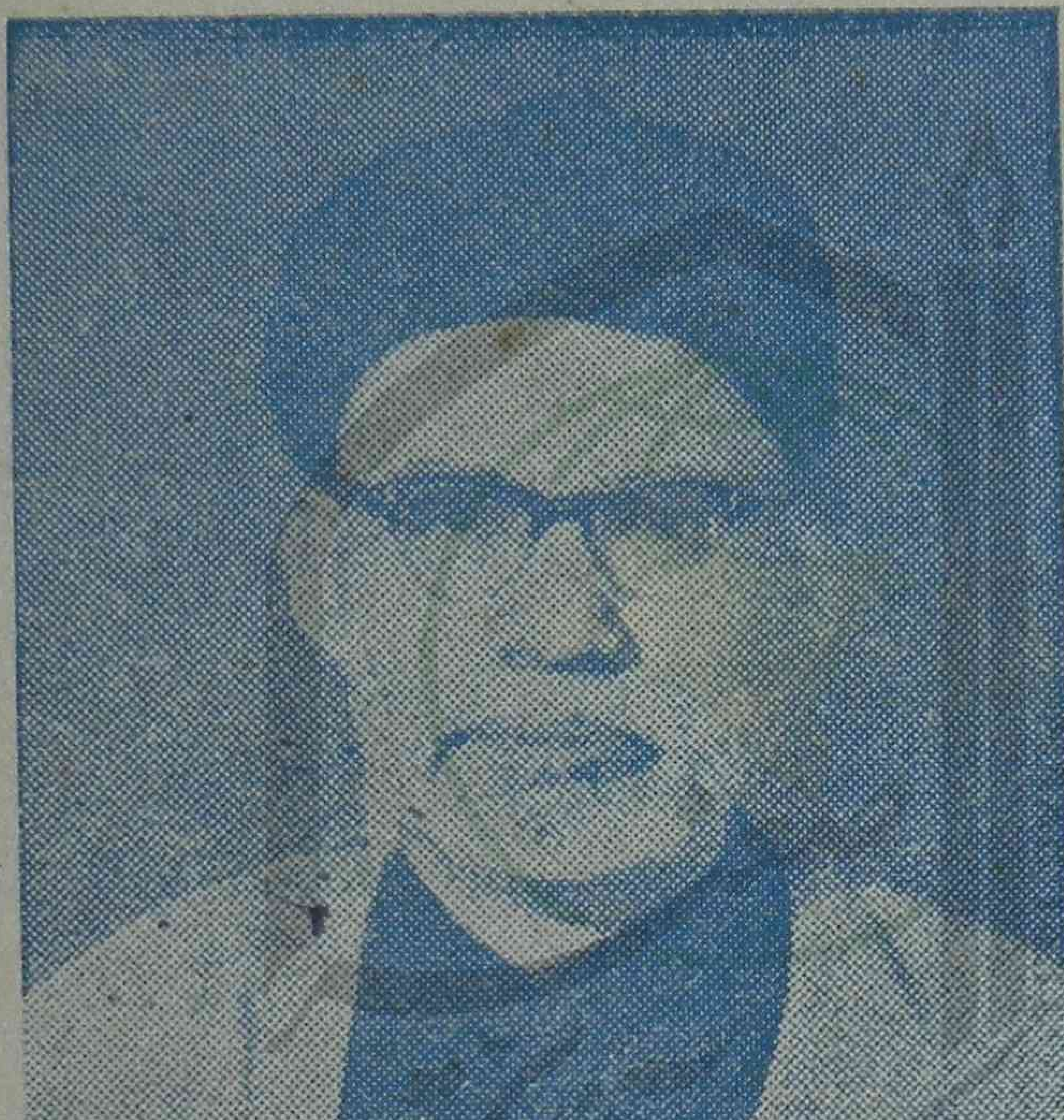
ماہ رجب سنہ ۱۳۸۲ھ

مطابق ماہ دسمبر سنہ ۱۹۶۲ء



سردار علی خاں واعظ

رل سکریٹری انجمن ناشرالعلوم مدرسۃ الواعظین کراچی -



مصنف کتاب ھذا حضرت ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب قبلہ
صدر پراونشیل شیعہ کانفرنس و صدر جامعہ امامیہ کراچی
و سرپرست رسالہ نور و مصنف یکصد و ھشتاد کتب